مرکز احیاء الفکر الاسلامی کا دینی، دعوتی، علمی، ادبی، تحقیقی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماهنامه نقوش اسلام

VOL.No.4	اکتوبر ۲۰۰۹ء (October,2009) ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ	Issue.No.8

زیر سرپرستی

مفکر ملت حضرت سید محمد رابع حسنی ندوی
ولی مرتاض حضرت مولانا سید مکرم حسین سنسارپوری
عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم رائے پوری

مجلس مشاورت

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی — مولانا محمد عامر صدیقی ندوی
مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی — الحاج موسیٰ اسماعیل درسوت
مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی — مولانا محمد احمد صالح جی
مولانا حافظ محمد ایوب — مولانا یحییٰ بام — مولانا محمد اختر قاسمی

مجلس ادارت

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی ❁ مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری ❁ مولانا حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

چیف ایڈیٹر: محمد مسعود عزیزی ندوی
مدیر انتظامی: حافظ عبدالستار عزیزی
مدیر معاون: ڈاکٹر مرغوب عالم عزیزی

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

NUQOOSH-E- ISLAM
MUZAFFARABAD.SAHARANPUR.247129
(U.P)INDIA.Ph.0132.2775452.Cell.09719831058
E.mail : nuqooshe_islam@yahoo.co.in
masood _azizinadwi@yahoo.co.in
ماہنامہ ''نقوش اسلام'' مظفرآباد، سہارنپور 247129 (یوپی) انڈیا

شرح خریداری

ہندوستان کے لیے
فی شمارہ .... ۱۰؍روپئے
سالانہ .... ۱۰۰؍روپئے
خصوصی .... ۳۰۰۰؍روپئے
ایشیائی، یورپی افریقی وامریکی ممالک کے لیے ۲۰؍ڈالر

رسالہ کے جملہ امور سے متعلق اس نمبر پر رابطہ کریں: **09719639955**

منیجر توسیع واشاعت: قاری محمد صالحین
09675335910/ 09813806392

Markazu Ihyail Fikril Islami , A/C No. 30416183580,S.B.I
Monthly Nuqoosh-e-Islam, A/C No. 30557882360,S.B.I

PRINTER, PUBLISHER AND OWNER MOHD.MASOOD AZIZI NADVI
PRINTED BY UNION PRINTING PRESS DEOBAND SAHARANPUR PUBLISHED AT
Vill&P.O.MUZAFFARABAD, DISTT.SAHARANPUR (U.P) **EDITOR**:MOHD.MASOOD AZIZI NADVI

E:\Photo Darul Uloom\Album DU\Tif Files\A017.TIF not found.
Uloom\Album DU\Tif Files\A003.TIF not found.
E:\Photo Darul Uloom\Album DU\Tif Files\A017.TIF not found.

اس شمارے میں

عناوین	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ		۳
گناہوں سے توبہ دخول جنت کا سبب	محمد مسعود عزیزی ندوی	
فکر وعمل		۶
عورت کی حیثیت عرفی کی بحالی......	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	
تبرکات اکابر		۱۲
امام العلماء حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی......	مولانا نور الحسن راشد کاندھلہ	
سیرت وکردار		۱۵
مسلم خواتین کے سچے واقعات	محمد شیث ادریس تیمی جامعہ نگر دہلی	
وقت کی آواز		۱۷
عربی مدارس کا نصاب تعلیم اور......	مولانا ندیم الواجدی قاسمی، دیوبند	
محاسن اسلام		۲۷
اسلام میں انسانی حقوق کی اہمیت	مولانا اسرار الحق قاسمی، نئی دہلی	
اعجاز قرآنی		۳۰
قرآن کریم کا اعجاز اور اس کے فنی محاسن	مولانا مفتی رحمت اللہ نیپالی ندوی	
یاد رفتگاں		۳۳
مولانا عبد الحمید صاحب قاسمی	ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، جامعہ ملیہ	
دعوت فکر		۳۶
مسلم معاشرے میں تعلیم کے تئیں بے حسی......	فیروز بخت احمد، ذاکر نگر، دہلی	
محاسبہ		۴۱
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں	مولانا فتح محمد ندوی، جامعہ ملیہ	
اصلاح معاشرہ		۴۳
اللہ ہی رزاق ہے	مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری	
حالات حاضرہ		۴۷
خبریں	حافظ عبد الستار عزیزی	

ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کے لئے شرح اشتہار

ٹائٹل صفحہ آخر رنگین	(فل سائز)	۳۰۰۰............
// // اول اندرونی	// //	۲۵۰۰............
// // آخر اندرونی	// //	۲۰۰۰............
صفحہ اندرونی	(فل سائز)	۱۰۰۰............
آدھا صفحہ اندرونی		۶۰۰............
¼ صفحہ //		۴۰۰............

○ اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ اسی رسالہ کے ساتھ آپ کی سالانہ مدت خریداری پوری ہورہی ہے، لہٰذا آئندہ کے لیے جلد ہی زرتعاون مبلغ ۱۰۰/ روپئے ارسال فرمائیں، تاکہ رسالہ کو جاری رکھا جاسکے۔ (ادارہ)

نوٹ: شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت سہارنپور کو ہی ہوگا۔

پرنٹر پبلیشر: محمد مسعود عزیزی ندوی نے یونین آفسٹ پریس دیوبند میں طبع کراکے دفتر ماہنامہ نقوش اسلام مظفر آباد سے شائع کیا

کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر: مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور، یوپی (الھند)

اداریہ

گناہوں سے توبہ دخول جنت کا سبب

محمد مسعود عزیزی ندوی

راقم نے یہ مضمون ۳۱/جولائی ۲۰۰۹ء کو جمعہ کی نماز سے قبل مرکز کی جامع مسجد میں نمازیوں کے ایک مجمع میں بیان کیا تھا، جس کا خلاصہ یہاں بطور اداریہ پیش کیا جارہا ہے

اللہ تبارک وتعالی نے انسانوں کی ہدایت کے لیے قرآن کریم کو اتارا، اور قرآن کریم کو الحمدللہ رب العالمین سے شروع کیا، اللہ تعالی نے جب اپنا تعارف کرانا شروع کیا تو اس نے الحمدللہ سے شروع کیا، کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے، اور وہ رحمان ورحیم ہے، سب سے زیادہ مہربان ہے، یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، وہ اپنے تعارف میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ قہار ہے، جبار ہے، اور زبردست پکڑ نیوالا ہے؛ لیکن اس نے اپنا تعارف رحمٰن ورحیم کے ساتھ کرایا، جس سے بندوں کے ساتھ اس کی رحمت کا، اس کی محبت کا، اس کے تعلق کا، اس کی ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے، مگر انسان چونکہ قدم بقدم پر گناہ کرتا ہے، قدم قدم پر اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے، ذرا ذرا سی بات پر وہ عقیدہ کا سودا کرلیتا ہے، ذرا ذرا سی بات پر وہ ڈگمگا جاتا ہے، اور ایسی ایسی خطائیں اور ایسے ایسے گناہ کرجاتا ہے کہ بعض مرتبہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا، اور بعض مرتبہ احساس ہوتا بھی ہے مگر غفلت کے پردے اس کی عقل پر، اس کے دماغ پر پڑ جاتے ہیں کہ اس کو محسوس نہیں ہوتا، اور وہ ایسے گناہ کردیتا ہے، ایسی خطائیں کردیتا ہے کہ جن سے اللہ تعالی کے مجرمین بندوں میں اس کا شمار ہونے لگ جاتا ہے؛ لیکن جو شخص سچے دل سے توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالی اس کو معاف کردیتا ہے، اس لیے کہ اللہ نے پہلے اپنا تعارف رحمان ورحیم سے کرایا ہے۔

دنیا میں اس سے زیادہ رحیم، دنیا میں اس سے زیادہ رحمان، اس سے زیادہ رحم کرنے والا اور اس سے زیادہ شفقت کرنے والا کوئی ہو نہیں سکتا، اس دنیا کی زندگی میں محبت وشفقت اور تعلق کی آخری مثال ماں کی محبت اور اس کی شفقت کو سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اگر وہ بچے کی پریشانی دیکھے، بچہ اس کو پریشان کرے، رات میں بار بار اٹھائے تو ماں اس کو جھڑک دیتی ہے اور اس کو برا بھلا کہہ دیتی ہے؛ کیونکہ محبت اور رحم اس کے اندر ہے؛ لیکن اس کی بشریت، اس کی انسانیت، اس کا انسان ہونا، یہ چیز اس پر غالب آجاتی ہے، اور وہ اس وقت بچے کی طرف سے تکلیف کو دیکھ کر برداشت نہیں کرپاتی اور ایسا کوئی کلمہ کہہ دیتی ہے جو بچے کے حق میں اچھا نہیں ہوتا، بلکہ ماں ہونے کے اعتبار سے خود اس کی زبان سے اچھا نہیں لگتا؛ لیکن وہ کہہ دیتی ہے، وہ کیوں کہتی ہے اس لیے کہ وہ بشر ہے، اور دنیا میں اس کی مثال دی جاتی ہے کہ ماں سے زیادہ رحیم کوئی ہو نہیں سکتا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں، اللہ تعالی اس ماں سے بھی زیادہ شفیق ہیں، اس ماں سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ بندہ اگر اللہ کے دربار میں سمندر کے جھاگ کے برابر، زمین اور آسمان کے برابر گناہ لے کر حاضر ہو اور اللہ تعالی کے سامنے توبہ کرے، تو اللہ تعالی اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، چونکہ اللہ تعالی توبہ کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں، ان کو محبوب رکھتے ہیں اور قرآن کریم میں اللہ تعالی خود فرما رہا ہے، اے ایمان والو! یہ خطاب عام انسانوں کو نہیں، یہ خطاب غیر مسلموں کو نہیں، یہ خطاب کافروں کو نہیں، یہ خطاب مسلمانوں کو ہے؛ بلکہ ایمان والوں کو ہے، جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اللہ کی کتابوں پر ایمان لائے، اللہ کے رسولوں پر ایمان لائے، اچھی بری تقدیر پر ایمان لائے، ان کے لیے یہ خطاب ہے، کہ تم اپنے پروردگار سے سچے دل سے توبہ کرلیا کرو، خواں تمہارے گناہ زمین وآسمان کے برابر ہوں، سمندر کے برابر ہوں، تو اللہ تعالی ان کو معاف کردے گا اور پھر ایسی جنتوں کے اندر، ایسے باغوں کے اندر اللہ تعالی داخل فرمائے گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جن جنتوں کی اور جن باغوں کی ہر مسلمان کو تمنا ہے، کسی بھی ادنی سے ادنی فرد کو لیجیے، آپ اس سے پوچھئے کہ تمہاری خواہش کیا ہے، وہ یہی کہے گا کہ اللہ مجھے جنت دیدے، حالانکہ اس کو معلوم نہیں کہ جنت کیا ہے، لیکن اس نے سن رکھا ہے تقریروں میں، پڑھ رکھا ہے کتابوں میں، مزید اپنی اماں اور اپنے ابا سے یہ سن رکھا ہے کہ جنت آرام کی جگہ ہے، جنت وہ جگہ ہے جس میں ہر چیز خواہش کی مطابق ملے گی، جنت وہ جگہ جس کے اندر کوئی تکلیف نہیں، جنت وہ جگہ ہے جس کے اندر کوئی احساس نہیں، احساس کا مطلب ہے کہ دنیا کے اندر کتنی ہی بڑی نعمت مل جائے، اگر ہم سامنے والے کو دیکھیں گے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس کے پاس کتنی اچھی ہے کاش کہ مجھے بھی مل جاتی، جنت کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں بھی آپ کو انعامات ملیں گے، جس درجہ کا بھی انعام ملے گا، جس درجہ کی بھی جنت ملے گی، دوسرے کو دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوگا کہ کاش ایسی میرے پاس بھی ہوتی، وہاں پر احساس نہیں ہوتا۔

• • • • ———— • • • •

اللہ تعالی کا یہ نظام ہے کہ دنیا کے اندر کسی کی خواہش کے مطابق کوئی چیز پوری نہیں ہوسکتی، چاہے وہ پوری دنیا کا حکمراں ہی کیوں نہ ہو، چاہے وہ پانچوں براعظموں کا بادشاہ کیوں نہ ہو، خواہ پوری دنیا پر اس کی حکومت چلتی ہو، مگر یہاں سو فیصد اس کو اس کی مرضی کے مطابق کھانا نہیں مل سکتا، اس کی مرضی کے مطابق بیویاں نہیں مل سکتی، اس کی مرضی کے مطابق محل اور مکانات نہیں مل سکتے، اس کی خواہش کے مطابق دوست واحباب، ہم نشین اور جانشین نہیں مل سکتے، کسی نہ کسی میں، کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہوگی اور کمی کا اس کو احساس ہوگا، صرف جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں مرضی کے مطابق، خواہش کے مطابق ہر چیز مہیا ہوگی، جیسا انسان ارادہ کرے گا ویسے ہی اس کو ملے گا، اگر آدمی اپنے گناہوں سے سچے دل سے توبہ کرلے، سچی توبہ کا مطلب یہ نہیں کہ بس زبان سے کہہ دے کہ اے اللہ میرے گناہوں کو معاف کردے، اے اللہ میری توبہ! جیسے ہم لوگ اپنے بچوں سے کروا دیتے ہیں کہ توبہ کرو، اب تو ایسا نہیں کرو گے، اس کا مطلب نہ اس کو معلوم، نہ اس کو احساس کہ کیا کہہ رہا ہوں، توبہ کا مطلب یہ ہے کہ شرمندہ ہو اپنے گناہ پر، اور جو گناہ کر رہا ہے اس کا چھوڑنے کا عہد کرے، اور پھر زندگی بھر اس گناہ کو نہ کرنے کا اللہ کے سامنے وعدہ کرے، تو یہ توبہ ہے، صرف زبان سے کہہ دینا کافی نہیں، جو کیا ہے اس پر شرمندہ ہو، آئندہ نہ کرنے کا عہد ہو کہ اس گناہ کو ہرگز نہ کروں گا، اور پھر اللہ کے سامنے آہ وزاری کے ساتھ، گریہ وزاری کے ساتھ، گڑگڑا کر، عاجزی وانکساری کے ساتھ سچے دل سے توبہ کرے، تو اللہ تعالی

معاف فرمادیں گے، ایسی توبہ کے متعلق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ توبہ کرنے والا شخص گناہوں سے، خطاؤں سے، لغزشوں سے ایسا پاک صاف ہوجاتا ہے جیسا کہ اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں، اس طرح اللہ تعالی اس کو فریش کردیتا ہے، ہم لوگ اپنی چیزوں کو ریفریش Refresh کرتے ہیں، ایسے ہی اللہ تعالی کے سامنے ہم اپنے کو ریفریش Refresh کریں گے، کیسے ریفریش کریں گے؟ توبہ کرکے، تو پھر ہم ایسے ہوجائیں گے جیسا ہم نے گناہ کیا ہی نہیں۔

• • • ———— • • •

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ ہر انسان اس دنیا کے اندر خطا کار اور گنہ گار ہے، کوئی بچا ہوا نہیں ہے، مگر بہترین گنہگار وہ ہے جو اللہ کے سامنے توبہ کرلے، اللہ کے سامنے اپنے گناہوں سے رجوع کرلے، رہا انبیاء کرام کا مسئلہ انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں، ان سے گناہ نہیں ہوتے اور صحابہ کرام ان سے گناہ ہوتے ہیں، تو اللہ نے ان کے لیے دنیا کے اندر سٹیفکیٹ جاری کردیا ہے ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کہ ان کے سب گناہ معاف، اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، باقی دنیا کا کتنا ہی بڑا ولی، کتنا ہی بڑا اللہ والا ہو، گناہ اس سے ہوسکتا ہے، اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام قرآن کریم میں اس کی گواہی دے رہے ہیں کہ بھائی میں اپنے نفس کی برأت کا اعلان نہیں کرسکتا، اپنے نفس کی کوئی گارنٹی نہیں لے سکتا، میں اپنے آپ کو گناہوں سے پاک وصاف نہیں سمجھ سکتا، گناہ ہوسکتا ہے، ہاں میرا رب مجھے اپنی رحمت کی چادر میں ڈھانپ لے، تو میں گناہوں سے بچ سکتا ہوں، اس لیے کہ میرا رب بڑا رحیم ہے، بڑا بخشنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے، نبی اس بات کو کہہ رہا ہے، خود اللہ کے نبی کی ایک روایت ایسی ہی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی بات بیان فرمائی کہ میری بھی مغفرت کا معاملہ نہیں ہوسکتا، میں بھی نہیں بچ سکتا مگر اللہ تعالی خود مجھے اپنی رحمت کے اندر اور رحمت کی چادر میں ڈھانپ لے، پھر دنیا کا کون انسان ایسا بچا ہوا ہے جس کی گارنٹی ہے، نبی اپنی گارنٹی نہیں لے رہا ہے جو معصوم ہوتا ہے، گناہوں سے پاک ہوتا ہے، پھر ہما شما کس کھیت کے مولی ہیں، جو اپنے آپ کو پاک صاف سمجھیں۔

• • • ———— • • •

اللہ نے ہمیں یہی طریقہ بتایا ہے کہ رات دن توبہ کرتے رہیں، پانچوں نمازوں کے بعد ہم توبہ کریں، جتنے گناہ ہم نے کئے ہیں، اندھیرے میں کئے، اجالے میں کئے، قصداً کئے، سہواً کئے، انجانے میں کئے یا جان بوجھ کر کئے، پروردگار عالم ہمارے تمام گناہوں کو معاف فرما، سوتے وقت بھی ہم توبہ کریں، انشاء اللہ ہماری توبہ قبول ہوگی اور ہم اللہ کے یہاں ایسے جائیں گے جیسے کہ ہم نے گناہ کیا ہی نہیں، دھلے دھلائے جائیں گے، کلین جائیں گے، صاف ستھرے جائیں گے، اس لیے ہمیں اس کا اہتمام کرنا ہوگا کہ اپنے گناہوں پر توبہ کرتے رہیں، اللہ سے ڈرتے رہیں، پنجوقتہ نماز کے بعد جب دعا کریں تو توبہ ضرور کرلیا کریں، اللہ تعالی مغفرت کرنے والا ہے، بخشش کرنے والا ہے، اللہ تعالی ہمیں سچے دل سے توبہ کی توفیق عطا فرمائے، اپنے گناہوں پر، اپنی خطاؤں پر شرمندگی اور ندامت عطا فرمائے اور پھر ان گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فکر و عمل

عورت کی حیثیت عرفی کی بحالی اور اس کے حقوق کی بازیابی

افادات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ..................مرتب: مولانا محمد عزیز اللہ ندوی ادارۃ الصدیق بہٹ

اسلام میں پیشتر طبقۂ نسواں کی حالت:

پہلے ہم یہاں کچھ تمہیدی باتیں کہنا چاہتے ہیں جو ان اقدامات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے، جو اسلام نے عورتوں کے مفاد میں کئے ہیں، یہاں مشہور عرب فاضل استاذ عباس محمود العقاد کی کتاب ''المرأۃ فی القرآن'' کے کچھ اقتباسات پیش کریں گے جو اس موضوع پر وسیع تحقیقی جائزہ کی حیثیت رکھتی ہے، مصنف موصوف نے اسلام سے پہلے مذاہب اور معاشروں میں عورت کے مقام سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''ہندوستان میں مانو کی شریعت، باپ، شوہر یا دونوں وفات ہوجانے کی صورت میں بیٹے سے علیحدہ عورت کا کوئی مستقل حق نہیں مانتی تھی اور ان سب کی وفات کے بعد عورت کا شوہر کے کسی قریبی رشتہ دار سے متعلق ہوجانا ضروری تھا، وہ کسی حال میں اپنے معاملہ میں خود مختار نہیں ہوسکتی تھی، معاشی معاملات میں اس کی حق تلفی سے زیادہ سختی اس کے شوہر سے علیحدہ زندگی کے انکار کی صورت میں تھی، جس کے مطابق بیوی کو شوہر کے مرنے کے دن مرجانا اور اس کے چتا پرستی ہوجانا ضروری تھا، یہ پرانی رسم برہمنی تمدن کے قدیم زمانہ سے سترہویں صدی تک برقرار رہی اور اس کے بعد مذہبی حلقوں کی ناپسندیدگی کے باوجود ختم ہوگئی۔

حمورابی کی شریعت (جس کی وجہ سے بابل مشہور ہوا تھا) عورت کو پالتو جانور سمجھتی تھی اور اس کی نظر میں عورت کی حیثیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس رو سے اگر کسی نے کسی لڑکی کو قتل کیا ہے تو قاتل کو اپنی لڑکی مقتولہ لڑکی کے بدلہ میں حوالہ کرنی ہوتی تھی، تاکہ لڑکی والا اسے قتل کردے، یا باندی بنالے، یا معاف کردے، مگر وہ اکثر حکم شریعت کے نفاذ کی خاطر قتل ہی کی جاتی تھی، یونان قدیم میں عورت ہر قسم کی حقوق اور آزادی سے محروم تھی، اسے ایسے بڑے گھروں میں رہنا ہوتا تھا جو رشتہ سے دور، کم کھڑکیوں والے ہوتے تھے، اور ان کے دروازوں پر پہرہ دار مقرر رہتے تھے، بیویوں اور گھریلو عورتوں کی طرف بے توجہی کے سبب بڑے یونانی شہروں میں ایسی محفلیں عام ہوگئی تھیں جن میں گانے والیوں اور حسین عورتوں سے دل بہلایا جاتا تھا، مہذب محفلوں میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ جانے کی بہت کم اجازت تھی، اسی طرح فلسفیوں کے حلقے عورتوں کی موجودگی سے خالی نظر آتے ہیں اور پیشہ ور عورتوں یا مطلقہ باندیوں جیسی شہرت وعزت کسی شریف خاتون کو حاصل نہیں ہوئی۔

ارسطو ''اہل اسپارٹا'' پر اعتراض کرتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کی عورتوں کے ساتھ نرمی برتتے ہیں اور انھوں نے ان کو وراثت، طلاق اور آزادی کے حقوق دے رکھے ہیں، جن سے وہ بلند مقام ہوگئی ہیں، وہ اسپارٹا کے زوال واضمحلال کو عورتوں کی بے جا آزادی کا نتیجہ سمجھتا ہے، قدیم رومیوں کا عورتوں کے ساتھ معاملہ قدیم ہندوؤں ہی جیسا تھا، جس کے تحت وہ باپ، شوہر اور بیٹوں کے ماتحت رہتی تھیں، اپنے تہذیبی عروج کے دور میں ان کا خیال تھا کہ ''نہ عورت کی بیڑی کاٹی جاسکتی ہے نہ اس کی گردن سے جوا اتارا جاسکتا ہے''۔

چنانچہ کاٹو کا قول تھا کہ ''رومی عورت ان قیود سے اسی وقت آزاد

ہوئی جب بغاوت اور نافرمانی کرکے رومی غلام آزاد ہوئے اور عورت کو غلام رکھنا ناممکن ہوگیا''۔

استاذ عقاد نے قدیم مصری تہذیب میں عورتوں کے بعض حقوق واختیارات کے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اسلام سے پہلے مصری تہذیب اور اس کے قوانین ختم ہو چکے تھے اور شرق اوسط میں اس دور میں رومی تہذیب کے سقوط اور اس کی عیاشی اور لذت پرستی کے ردعمل کے طور پر دنیوی زندگی سے نفرت کا رجحان پیدا ہوگیا تھا، بلکہ زندگی اور آل اولاد کی طرف سے سرد مہری پیدا ہوگئی تھی، اور زاہدانہ رجحان نے جسم اور عورت کو نجس سمجھ لیا تھا، اور عورت کو گناہوں کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا اور غیر ضرورت مند کے لیے اس سے دوری اچھی سمجھی جاتی تھی۔

یہ قرون وسطی کے اس رجحان ہی کا اثر تھا کہ پندرہویں صدی عیسوی تک بعض علماء لاہوت اور عورت کی فطرت کے بارے میں غور کررہے تھے، اور ''ماکون'' کے اجتماع میں وہ یہ سوال کررہے تھے کہ کیا وہ جسم بلا روح ہے یا روح رکھنے والا جسم ہے، جس سے نجات یا ہلاکت متعلق ہوتی ہے؟ اکثریت کا خیال یہ تھا کہ وہ نجات پانے والی روح سے خالی ہے اور اس میں کنواری مریم علیہا السلام والدہ حضرت مسیح کے سوا کسی کا استثناء نہیں۔

رومی عہد کے اس رجحان نے بعد کی مصری تہذیب میں عورت کے مقام کو متأثر کیا، مصریوں پر رومی مظالم کی شدت ان کی رہبانیت اور دنیا بیزاری کا سبب بن گئی تھی، چنانچہ بہت سے زاہد لوگ رہبانیت کو قرب الٰہی کا ذریعہ اور شیطان کے مکر سے (جس میں عورت سرفہرست تھی) دوری کا وسیلہ جانتے تھے۔

بہت سے مغربی مؤرخین یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام نے اپنی شریعت میں اگلی شریعتوں خصوصاً شریعت موسوی سے بہت کچھ اخذ کیا ہے، اس دعوی کا بطلان توراتی شریعت اور قرآنی شریعت میں عورتوں کے مقام کے باہمی موازنہ ہی سے اچھی طرح ہوجاتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسی علیہ السلام کی طرف منسوب کتابوں کی تعلیم کے مطابق لڑکی باپ کی میراث سے خارج ہوجاتی ہے، اگر اس کی اولاد ذکور موجود ہو، یہ اس ہبہ کی قبیل سے ہے جسے باپ اپنی زندگی میں اختیار کرتا ہے تاکہ مرنے کے بعد واجبات شرعیہ کی طرح میراث واجب نہ ہو، میراث کے بارے میں حکم صریح یہ ہے کہ جب تک اولاد مذکور رہے گی لڑکی اس سے محروم رہے گی اور جس لڑکی کو میراث ملے گی، اسے کسی دوسرے قبیلہ میں شادی کی اجازت نہ ہوگی اور نہ اسے کسی اور قبیلہ کی طرف میراث منتقل کرنے کی اجازت ہوگی، یہ حکم کتب تورات میں متعدد جگہوں پر ہے۔

اب ہم ان بلاد مقدسہ کی طرف رخ کرتے ہیں جہاں قرآن کریم کی دعوت شروع ہوئی تھی یعنی جزیرۃ العرب، مگر آپ کو وہاں بھی اس کی توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہاں عورتوں کے ساتھ انصاف اور اکرام کا کوئی الگ معاملہ کیا جاتا تھا، بلکہ جزیرۃ العرب کے بعض اطراف میں عورت سے بدمعاملگی دنیا کے سارے ملکوں سے زیادہ تھی اور بعض اطراف میں اس سے اچھا معاملہ کیا جاتا تھا اور اس کی شوہر کے یہاں عزت تھی کہ وہ کسی بارعب رئیس کی لڑکی یا کسی محبوب بیٹے کی ماں ہے، لیکن اس کی عزت صرف اس لیے کی جاتی کہ وہ عورت ہے اور اس حیثیت سے وہ حقوق کی مستحق ہے، اس کی توقع نہیں کرنی چاہئے کہ باپ، شوہر، بھائی اور بیٹے اپنی ملکیت یا حمایت میں داخل اشیاء کی طرح اس کی حفاظت کرتے تھے کیونکہ یہ آدمی کے لیے عیب تھا کہ اس کی حرم کی بے حرمتی کی جائے، جس طرح یہ عیب تھا کہ اس کی حمایت یافتہ یا کسی ممنوعہ چیز پر دست درازی کی جائے، جس میں اس کے گھوڑے، جانور، کنواں اور چراگاہ شامل تھی، وہ مال و مویشی کے ساتھ میراث میں منتقل ہوتی تھی، آدمی شرم کے مارے اپنی بیٹی کو بچپن ہی میں زندہ درگور کردیتا تھا اور اس پر خرچ کو بوجھ سمجھتا تھا، جب کہ اپنی مملوکہ باندی یا نفع بخش جانور پر خرچ کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا تھا اور جو اسے زندہ رکھتے اور بچپن میں جاں بخشی کردیتے، ان کی نظر میں اس کی قیمت میراث کی تھی

، جو باپ سے بیٹوں کو منتقل ہوتی تھی ، اور قرض یا سود کی ادائیگی میں اسے بیچا اور رہن رکھا جا سکتا تھا، وہ اس انجام سے اسی وقت بچ سکتی تھی ، جب وہ کسی معزز قبیلے کی فرد ہوتی جس کی حمایت وقربت کو وقعت حاصل ہوتی تھی۔

بدھ مت:

بدھ مت میں عورت کے بارے میں خیالات کا ایک نمونہ ''مذہب واخلاق کی انسائیکلو پیڈیا'' کے مقالہ نگارنے ایک بدھ مفکر Chullavgga کے قول سے پیش کیا ہے، جیسے Oldenberg نے اپنی کتاب Buddha صفحہ ۱۶۹/ پر نقل کیا ہے کہ ''پانی کے اندر مچھلی کی ناقابل فہم عادتوں کی طرح عورت کی فطرت بھی ہے، اس کے پاس چوروں کی طرح متعدد حربے ہیں اور سچ کا اس کے پاس گزر نہیں۔

ہندودھرم:

مذکورہ انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار عورتوں کے بارے میں ہندوؤں کے خیالات کے بارہ میں لکھتا ہے:

برہمن ازم میں شادی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ہر شخص کو شادی کرنا چاہئے؛ لیکن منو کے قوانین کی رو سے شوہر بیوی کا سرتاج ہے، اسے اپنے شوہر کو ناراض کرنے والا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے حتی کہ وہ اگر دوسری عورتوں سے تعلقات رکھے یا مرجائے، تب بھی کسی دوسرے مرد کا نام اپنی زبان پر نہ لائے، اگر وہ نکاح ثانی کرتی ہے، تو وہ سورگ سے محروم رہے گی، جس میں اس کا پہلا شوہر رہتا ہے، زوجہ کے غیر وفادار ہونے کی صورت میں اسے انتہائی کڑی سزا دی جانی چاہئے، عورت کبھی بھی آزاد نہیں ہوسکتی، وہ ترکہ نہیں پاسکتی، شوہر کے مرنے پر اپنے سب سے بڑے بیٹے کے تحت زندگی گزارنی ہوگی، شوہر اپنی بیوی کو لاٹھی سے بھی پیٹ سکتا ہے، یونیورسل ہسٹری آف ورلڈ میں Ray Strachey ہندوستان کے بارے میں لکھتا ہے:

رگ وید میں (جس میں انسان کے جدامجد کی حکایات بھی ہیں) عورتوں کو پست اور حقیر مقام دیا گیا ہے، بعد میں یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ روحانی طور پر ناقابل اعتبار بالکل تقریباً بے روح ہے، اور موت کے بعد مردوں کی نیکیوں کے بغیر اسے بقا نہیں حاصل ہوسکتی، اس کی ساری امیدوں کو ختم کرنے والے مذہب کے ساتھ رسم ورواج کی بیڑیوں نے (جو رفتہ رفتہ پیدا ہوتی گئی) یہ ناممکن کردیا کہ عورت کسی نمایاں شخصیت کو جنم دے سکے، عورتوں کو جنم دینے والے منو نے انھیں اپنے گھر، بستر، زیور کی محبت، بری خواہشیں، غصہ، بے ایمانی، اور برے اطوار عطا کئے، عورتیں اتنی بری ہیں جتنا کی جھوٹ، یہ ایک مسلم حقیقت تھی، عورت کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ مردوں کو اس دنیا میں غلط راستہ پر ڈالے، اس لیے عقلمند عورتوں کی صحبت میں بے فکر ہوکر نہیں بیٹھتے، بچپن کی شادی کی رسم، بیواؤں سے نفرت پرستی اور پردہ ایک ایسے سماج کی حسب حال ہیں جس میں عورتوں کی اہمیت بچے جننے والی مخلوق سے زائد نہیں، شاید نوزائیدہ لڑکیوں کی موت ایک ایسی دنیا میں ان کے لیے رحمت ہے جس میں اسے شکوک، برائی کا اچھا سرچشمہ، دھوکہ باز، سورگ کا راستہ اور نرک کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت:

برہمنی زمانہ اور تہذیب میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا تھا جو ویدی زمانہ میں تھا، منو کے قانون میں بقول ڈاکٹر لی بان ''عورت ہمیشہ کمزور اور بیوفا سمجھی گئی ہے اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے''۔

شوہر مرجاتا تو عورت گویا جیتے جی مرجاتی اور زندہ درگور ہوجاتی وہ کبھی دوسری شادی نہ کرسکتی، اس کی قسمت میں طعن وتشنیع اور ذلت وتحقیر کے سوا کچھ نہ ہوتا، بیوہ ہونے کے بعد اپنے متوفی شوہر کے گھر کی لونڈی اور دیوروں کی خادمہ بن کر رہنا پڑتا، اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہوجاتی۔

ڈاکٹر ''لی بان'' لکھتا ہے کہ بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلنے کا ذکر منوشاشتر میں نہیں ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں عام ہوچلی تھی، کیونکہ یونانی مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔

غرض یہ سرسبز وشاداب ملک جو فطرت کے خزانوں سے مالا مال تھا، سچے آسمانی مذاہب کی تعلیمات سے عرصہ سے محروم ہونے اور مذہب کے مستند مآخذوں کے گم ہوجانے کی وجہ سے قیاسات وتحریفات کا شکار اور رسوم وروایات کا پرستار بنا ہوا تھا، اوراس وقت کی دنیا میں جہالت وتوہم پرستی، پست درجہ کی بت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ واری ناانصافی میں پیش پیش تھا اور دنیا کی اخلاقی وروحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بدنظمی میں مبتلا تھا۔

چین:

مسٹر رے اسٹریچی چین میں عورت کی حیثیت کے بارے میں لکھتا ہے: ''مشرق بعید یعنی چین میں حالات اس سے بہتر نہیں تھے، چھوٹی لڑکیوں کے پیروں کو کاٹھ مارنے کی رسم کا مقصد یہ تھا کہ انھیں بے بس اور نازک رکھا جائے، یہ رسم اگر چہ اعلی اور مالدار طبقات میں رائج تھی لیکن اس سے ''آسمانی حکومت'' کے دور میں عورتوں کی حالت پر روشنی پڑتی ہے''۔

انگلستان:

مذکورہ مقالہ نگار انگلستان میں عورتوں کے مقام کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ ''وہاں اسے ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم رکھا گیا تھا، تعلیم کے دروازے اس پر بند تھے، صرف چھوٹے درجہ کی مزدوری کے علاوہ وہ کوئی کام نہیں کرسکتی تھی اور شادی کے وقت اسے اپنی ساری املاک سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ قرون وسطی سے انیسویں صدی تک عورت کو جو درجہ دیا گیا تھا اس سے کسی بہتری کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

جاهلیت میں عورت کا درجہ:

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم وبدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی، اس کے حقوق پامال کئے جاتے، اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کرسکے، دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی، مرد تو اپنا پورا پورا حقوق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہوسکتی تھی، کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں۔

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انھیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا، ہثیم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام قبائل میں رائج تھا، ایک اس پر عمل کرتا تھا، دس چھوڑتے تھے، یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک کہ اسلام نہیں آیا، بعض ننگ وعار کی بنا پر، بعض خرچ ومفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے، عرب کے بعض شرفاء اور روٴسا ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے اور انکی جان بچا لیتے، صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا، بعض اوقات کسی سفر مشغولیات کی وجہ سے لڑکی سیانی ہوجاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی، جاہل باپ دھوکہ دے کر اس کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کرآتا، اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔

اسلام میں عورتوں کا مقام:

اسلام نے عورتوں کو جو مرتبہ دیا ہے اور عورتوں کی زندگی میں بلکہ دنیا کی معاشرتی زندگی میں جو انقلاب عظیم برپا کیا ہے وہ پڑھی لکھی تعلیم یافتہ خواتین کو معلوم ہوگا، دنیا کے مختلف مذاہب اور قوانین کی تعلیمات کا مقابلہ اسلام کے اس نئے منفرد وممتاز کردار سے اگر کیا جائے جو اسلام نے عورت کے وقار واعتبار کی بحالی، انسانی سماج میں اسے مناسب مقام دلانے، ظالم قوانین، غیر منصفانہ رسم ورواج اور مردوں کی خود پرستی، خودغرضی اور تکبر سے اسے نجات دلانے کے سلسلہ میں انجام دیا ہے تو آنکھیں کھل جائیں گی اور ہر ایک پڑھے لکھے آدمی کو حقیقت پسند انسان کو اعتراف واحترام میں سر جھکا دینا پڑے گا، قرآن مجید پر ایک سرسری نظر ڈالنا بھی عورت کے بارے میں جاہلی نقطۂ نظر

اورقرآنی اسلامی زاویۂ نگار کے کھلے فرق کوسمجھنے کے لیے کافی ہے، آپ کومعلوم ہے کہ دین میں، دین کے احکام ومسائل میں، فرائض میں عبادات میں، عقائد میں اورعلم میں کم سے کم ہماراجس امت سے تعلق ہے، جس دین سے تعلق ہے، اس میں عورتیں محروم نہیں رکھی گئیں اور انہیں نظرانداز نہیں کیا گیا بلکہ وہ اس میں شریک ہیں، اس لیے کہ ان کے لیے مستقل احکام ومسائل اور نماز وروزہ، حج، زکوۃ اور اس کے علاوہ دین کے دوسرے مسائل وعبادات میں وہ برابر کی شریک ہیں اور اسی طرح وہ دین وعلم، خدمت اسلام، خیروتقوی میں تعاون اور صالح معاشرہ کی تعمیر میں پوری طرح حصہ لےسکتی ہیں۔

قرآن کریم قبول اعمال، نجات وسعادت اورآخرت کی کامیابی کے بیان میں ہمیشہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر کرتا ہے "ومن یعمل من الصالحات من ذکراو انثی وھو مومن فاولئك یدخلون الجنة ولا یظلمون نقیرا" (سورہ نساء ۱۲۴) اور جوکوئی نیکیوں پرعمل کرے گا، خواہ مردہو یا عورت اوروہ صاحب ایمان ہوتو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اوران پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔

دنیا کے بہت سے مذاہب ایسے ہیں جس میں بعض کام مردوں کے ساتھ خاص ہیں، عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ عورتیں اس کو ہاتھ نہیں لگاسکتیں، ان کا اس سے قریب ہوجانا یا پرچھائی پڑجانا بھی اس کام کو برباد کردیتا ہے۔

دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب عیسائیت جس کے پیرو دنیا میں شاید سب سے زیادہ ہیں، عیسائیت باوجود اس کے کہ وہ یورپ میں پلی بڑھی اور پھلی پھولی اس میں عورتوں کو بہت سی چیزوں سے محروم رکھا گیا ہے۔

قرن وسطی میں ایک زمانہ گزرا ہے جس میں یہ تھا کہ عورت کسی چیز کی مالک نہیں ہوسکتی، اپنے حقوق ان کو حاصل نہیں تھے، وہ کسی زمین کی مالک ہوایسا نہیں ہوسکتا تھا، بہت سی عبادتیں اورفرائض ایسے تھے جوان کے لیے ناجائز تھے اورلوگ عورتوں کے سایہ سے بھاگتے تھے، بہت سی عورتوں اور بچیوں کو راہب بنا کر گرجاؤں میں بیٹھا دیا کرتے تھے، ان کی مائیں روتیں تھیں اوربلکتیں تھیں اور جب وہ انھیں ڈھونڈنے آتیں توراہب ان کے سایہ سے بھاگتے تھے کہ کہیں ان کا سایہ نہ پڑجائے۔

یہ تو قرآن کا معجزہ ہے کہ اس میں اللہ تعالی نے سب چیزوں میں عورتوں کا ذکرالگ الگ کیا ہے، اگرساتھ کہہ دیا جاتا تو شاید ذہن پورے طور پرکام نہ کرتا اور جو اللہ تعالی نے مرتبے بیان کئے ہیں ان میں سب کا ذہن نہ جاتا، لیکن اللہ تعالی نے ایک ایک جز میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر کیا ہے، ہمت افزائی کے لیے بھی اوران کا درجہ بڑھانے کے لیے بھی اور بہت سے مسائل میں ان خیالات کو دور کرنے کے لیے بھی کہ شاید اس میں عورتوں کا حصہ ہو، اس میں نہ ہو، اس لیے اللہ تعالی نے عورتوں کا ذکر الگ سے کیا ہے۔

قرآن مجید صرف طاعات وعبادات اور مذہبی فرائض ہی کے سلسلہ میں نماز روزہ ہی کے سلسلہ میں مردوں اورعورتوں کی مساوات وشرکت کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ اس کی تعلیمات کی رو سے باصلاحیت مردوں علماء اور بڑی ہمت اورعزم رکھنے والے مردوں اور نمایاں افراد کے ساتھ ساتھ اخلاقی احتساب "امر بالمعروف نہی المنکر"، یعنی اسلامی معاشرے کی نگرانی ورہنمائی اس کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے اور صحیح راستہ پر چلنے کے سلسلہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ذمہ داری میں شریک ہیں، اللہ تعالی ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو ایک متحدہ اور خیروتقوی پرتعاون کرنیوالی جماعت کی ایک محاذ کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ فرماتا ہے: والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلاۃ ویوتون الزکاۃ ویطیعون اللّٰہ ورسولہ اولئك سیرحمھم اللّٰہ ان اللّٰہ عزیز حکیم"۔

اور ایمان والے اور ایمان والیاں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، نیک باتوں کا آپس میں حکم دیتے ہیں، اور بری باتوں سے روکتے ہیں نماز کی پابندی رکھتے ہیں، زکوۃ دیتے رہتے ہیں، اللہ اوراس کے رسول

کی اطاعت کرتے رہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر ضرور رحم کرے گا، بے شک اللہ بڑا اختیار والا ہے، اور بڑی حکمت والا ہے، وہ شرف انسان کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچنے کا ذریعہ اور کامل معیار جنس ونسل اور رنگ وخون سے قطع صرف تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔

"یایھا الناس انا خلقناکم من ذکر او انثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر"۔(الحجرات۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے پرہیزگار اور اللہ کے نزدیک معزز تر ہے، بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے، پورا خبردار ہے۔

یہ سب باتیں عورتوں میں اہمیت اور خود داری اور خود اعتماد پیدا کرنے اور جدید نفسیات کی اصطلاح میں انھیں احساس کمتری سے دور رکھنے کے لیے بہت کافی ہیں۔

ان ہی تعلیمات کے نتیجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے عصر حاضر تک مشاہیر خواتین اسلام معلمات اور تربیت کرنے والی جہاد اور تیمارداری کرنے والی ادیب ومصنف، حافظ قرآن وحدیث کی راوی، عابد وزاہد اور معاشرہ میں صاحب حیثیت ووجاہت خوانی کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے، جن سے علمی استفادہ کیا گیا اور جن سے تربیت حاصل کی گئی اور جو معیاری ومثالی شخصیت کی حامل تھیں۔

وہ حقوق جو اسلام نے مسلمان عورتوں کو دیئے ہیں ان میں چند یہ ہیں: ملکیت ومیراث کا حق، خرید وفروخت کا حق، شوہر سے علیحدگی (خلع) اگر ضروری ہو منگنی ختم کرنے کا حق (اگر اس سے راضی نہ ہو) عیدین، جمعہ اور جماعت کی نمازوں میں شرکت کا حق ان کے علاوہ حقوق کی تفصیلات فقہی کتابوں میں موجود ہیں۔

❁❁❁❁❁

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کی

اہم تصانیف

۱- مختصر تجوید القرآن (بروایت حفص اردو) ۱۰؍روپئے

۲- بچوں کی تمرین التجوید (تجوید کے قواعد، مشق اور طریقہ تدریس اردو) ۱۰؍روپئے

۳- جیب کی تجوید (تجوید کے ضروری قواعد کا پاکٹ سائز مجموعہ) ۳؍روپئے

۴- ریاض البیان فی تجوید القرآن (بروایت حفص عربی) ۲۰؍روپئے

۵- رہنمائے طریقت (شریعت وطریقت، تصوف وسلوک، اخلاق حمیدہ ورذیلہ) ۱۰؍روپئے

۶- مراجع الفقہ الحنفی ومیزاتہا (فقہ حنفی کے مراجع اور ان کی خصوصیات، عربی) ۵؍روپئے

۷- الامامۃ فی الصلاۃ مسائلہا واحکامہا (امامت کے مسائل واحکام، عربی) ۳۰؍روپئے

۸- التدخین بین الشرع والطب (تمباکو ونشہ آور چیزیں شریعت وطب کی روشنی میں، عربی) ۲۰؍روپئے۔

۹- حیات عبدالرشید (حضرت رائے پوری کے خلیفہ حضرت حافظ عبدالرشید صاحب رائے پوریؒ کی سوانح حیات) ۵۰؍روپئے

۱۰- سیرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ (حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب کے والد ماجد کی سوانح حیات) ۵۰؍روپئے

۱۱- تذکرہ مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ (مولانا محمد میاں شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی وناظم اعلی جمعیۃ علماء ہند کے حالات زندگی اور کارنامے) ۵۰؍روپئے

۱۲- تذکرہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ (مولانا اشرف علی تھانوی کے مختصر حالات زندگی) ۸؍روپئے

۱۳- تذکرہ علامہ سید سلیمان ندویؒ (علامہ ندویؒ کے مختصر حالات زندگی) ۸؍روپئے

۱۴- تذکرہ حضرت مدنی (حضرت سید حسین احمد مدنی کے مختصر واہم حالات) ۸؍روپئے

۱۵- چند مایہ ناز اسلاف قدیم وجدید (چودہ بزرگوں کے حالات) ۳۰؍روپئے

۱۶- مقالات ومشاہدات (مختلف موضوعات پر ۲۷ مضامین کا مجموعہ) ۳۰؍روپئے

۱۷- مکتوبات اکابر (۲۰؍بزرگوں کے خطوط کا مجموعہ) ۳۰؍روپئے

۱۸- چندہ دینے، دلوانے اور لینے کے آداب واصول ۱۰؍روپئے

ملنے کا پتہ

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور (یوپی)

تبرکات اکابر

امام العلماء حضرت علامہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی آخری علمی تحریری یادگار

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مدیر سہ ماہی ''احوال وآثار'' کاندھلہ مظفر نگر

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی جلالت شان، حضرت موصوف کی تصانیف اور علوم مؤلفات کی معنویت، ان کی گہرائی اور تہہ داری ہمارے جیسوں کے تعارف کی محتاج نہیں، حضرت مولانا کی ہر ایک تصنیف ومکتوب، تالیف وتحریر کے زمانہ سے آج تک اہل نظر کی توجہات کا مرکز، بلکہ ان کی نگاہوں کا سرمہ اور علمی دنیا کے لیے لعل شب چراغ بنی ہوئی ہے، لیکن اس منزلت اور پذیرائی کے باوجود حضرت مولانا کی متعدد تالیفات وتحریرات ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، ان کی طباعت واشاعت کا اہتمام نہیں ہوا۔

یہاں یہ اطلاع مفید ہوگی کہ حضرت مولانا نانوتویؒ کی جملہ مطبوعہ تصانیف بلکہ اکثر کی جملہ اشاعتیں، ان کے ترجمے، حواشی اور شروح ومتعلقات کا غالباً پورے برصغیر میں سب سے بڑا سرمایہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، جس میں چند غیر مطبوعہ تصانیف اور مکتوبات وافادات بھی شامل ہیں، اس ذخیرہ نوادر وتبرکات میں سے حضرت مولانا کی ایک مختصر جامع تحریر، جو زکوۃ اور مجلس میلاد نبوی کے بعض پہلوؤں کی وضاحت پر مشتمل ہے۔

یہ حضرت مولانا کا ایک گرامی نامہ ہے جو نواب احمد حسین خاں کے نام صادر ہوا ہے، نواب صاحب نے حضرت مولانا سے زکوۃ کا ایک مسئلہ اور مروجہ مجالس میلاد کا حکم اور غالباً اس کی ممانعت کی وجہ جاننی چاہی تھی، حضرت مولانا نے جو آخر میں اختلافی موضوعات پر بہت کم لکھتے تھے، مکتوب نگار کے خلوص اور ذاتی روابط کی وجہ سے اس کا مختصر جواب تحریر فرمایا تھا، جس میں زکوۃ کے مسئلہ کی بھی کسی قدر وضاحت کی ہے اور مجالس مولود کی مخالفت کی ایک نہایت لطیف اور خاص وجہ بیان فرمائی ہے۔

یہ گرامی نامہ حضرت مولانا کی حیات کے آخری دور کی یادگار ہے، یہ مکتوب گرامی ۱۹؍ربیع الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۳؍مارچ ۱۸۸۰ء کو لکھا گیا تھا، اس تحریر سے صرف ڈیڑھ مہینہ بعد حضرت کی وفات ہوئی تھی، یہ زمانہ حضرت مولانا کے گویا مرض وفات کا تھا، اس عرصہ میں بھی حضرت مولانا کی صحت کی جانب سے اطمینان نہ ہوا، طبیعت خراب ہی رہتی تھی، اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ حضرت مولانا کا آخری مکتوب گرامی اور آخری علمی تحریر ہو، اگر بالکل آخری تحریر نہ ہو تب بھی آخری تحریرات میں شامل ہے، اب تک اس کا صرف ایک قلمی نسخہ معلوم ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ مکتوب گرامی بلا تأمل نوادر وتبرکات میں شامل کئے جانے کا مستحق ہے۔

اس مکتوب گرامی کا میری ناچیز معلومات میں اس وقت تک کہیں تذکرہ نہیں آیا، راقم سطور کی تالیف ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال وآثار وباقیات ومتعلقات'' میں، حضرت کے آثار ومکتوبات کی مفصل فہرست 'ماثر قاسمی' میں بھی اس کا تعارف شامل نہیں، اس لیے تحفہ نادر سمجھ کر شائع کیا جارہا ہے۔

مکتوب گرامی:

مظہر الطاف وکرم نواب احمد حسین خان صاحب سلمکم اللہ تعالی

السلام علیکم:

زکوۃ میں کھانا، کپڑا وغیرہ دینا بھی ایسا ہی ہے جیسا نقد دینا، پراتنا لحاظ ضروری ہے کہ کھانے میں دعوت کا سا قصہ نہ ہو کہ جتنا پیٹ میں آئے کھالو، لے جانے کی اجازت نہیں، بلکہ جس کو دیا جائے اسی کو اختیار کلی دیا جائے، وہ اسی کی ملک سمجھی جائے، اس کو اختیار ہو جائے، بیچ ڈالے یا خود کھالے، اور قرض میں زکوۃ ایام قرض کی بھی دینی پڑے گی، اتنا فرق ہے کہ اگر قرض کی یہ کیفیت ہے کہ جب چاہو وصول کرلو، تب تو اسی وقت واجب الادا ہوگی، ورنہ بعد وصول واجب الاداء ہوگی، مگر دینی سبھی دنوں کی پڑے گی۔

باقی رہا مولود شریف کا قصہ، اس میں آپ کا پوچھنا فضول معلوم ہوتا ہے اور میرا بولنا بیکار نظر آتا ہے، اس قسم کی باتوں میں زبان ہلانے کا نتیجہ بجز فتنہ پردازی اور کچھ نہیں ہوتا، مگر چونکہ آپ نے پہلی بار یہ استفسار فرمایا ہے، جواب لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، سنئے:

اگر کوئی شخص ملازمان شاہی میں سے سر دربار، بادشاہ سے زیادہ کسی وزیر مشیر کی تعظیم کرے تو وہ تعظیم چونکہ موجب توہین بادشاہی ہے، اس لیے بوجہ تعظیم مفرط وزیر یہ تعظیم کرنے والا مستوجب عتاب بادشاہی ہوگا، تعظیم وزیر کچھ کام نہ آئے گی، بلکہ خود وزیر بوجہ مذکور درپے تذلیل شخص مذکور ہو جائے گا، جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے۔

اعلی درجہ کی وہ مجلس ہے جس میں قرآن وحدیث پڑھایا جائے اور بیان احکام خداوندی کیا جائے اور کیوں نہ ہو! انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اس غرض سے بھیجے گئے کہ احکام خداوندی پہنچائیں اور کتب مقدسہ اسی غرض سے نازل کی گئیں کہ احکام خداوندی معلوم ہو جائیں، خود خداوند کریم فرماتا ہے: "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"۔ (الذاریات ۵۶) دوسری جگہ ارشاد ہے: "وما امروآ الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین"۔ (سورہ بینہ آیت ۵)

اور ظاہر ہے کہ عبادت، اطاعت احکام کا نام ہے، اس لیے وہ مجلس جس میں بیان احکام ہو، اعلی درجہ کی مجلس ہوگی، کیونکہ غرض اصلی عبادت ہے، چنانچہ دونوں آیتیں اس پر شاید ہیں، بے بیان، احکام محقق نہیں ہو سکتے، غرض مجلس وعظ و درس قرآن وحدیث کے برابر کوئی محفل نہیں، پھر ستم یہی نہیں کہ اس محفل کے لیے تو کچھ اہتمام نہ ہو، نہ اس میں اس برکت کی امید ہو، جو محفل میلاد شریف سے رکھتے ہیں اور نہ اس کے لیے فرش وفروش، روشنی وشیرینی وغیرہ ہو جو محفل میلاد شریف کے لیے مہیا کی جاتی ہے، علاوہ بریں میلاد شریف کی بدولت جماعت سی واجب چیز کو ترک کیا جائے اور جماعت کے لیے میلاد شریف ترک نہ کیا جائے اور یہ اسی قسم کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ بادشاہ سے زیادہ وزیر کی تعظیم کی جائے۔

پھر اس پر قیام معمول بہ اگر بایں اعتقاد ہے کہ روح پرفتوح حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت رونق افروز ہوتی ہے تو یہ اعتقاد بے سند ہے کہ جس کا پتہ نہ قرآن میں، نہ نشان حدیث میں، اگر یہ بدعت نہ ہوگا تو اور کون سی چیز بدعت ہوگی؟ شیعوں اور خوارج کے اعتقادات جو ان کے مبتدع اور ضال ہونے کی وجہ سمجھی گئی تو کیوں سمجھی گئی؟ اسی بے سند ہونے کے باعث اور اگر بایں خیال یہ اہتمام قیام ہے کہ بعض اولیائے کبار اس وقت کھڑے ہوئے تھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم بھی اسی طرح مشرف بہ زیارت ہوتے ہیں جیسے وہ اولیاء مشرف ہوئے تھے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض اولیائے کبار ارباب حال کو وقت ذکر ولادت شریف، دولت زیارت میسر آئی تھی، اس لیے ان کے واسطے اٹھنا ضروری ہوا، بے شک اگر وہ اس وقت نہ اٹھتے تو عجب نہ تھا کہ اس بدتعظیمی کے سبب اپنے مرتبہ ومقام سے گر جاتے مگر عوام الناس جو ان کی اقتداء کرتے ہیں گویا زبان حال سے یوں جتلاتے ہیں کہ گویا ہم بھی دولت زیارت سے مشرف ہوئے ہیں، اب کہئے یہ کس درجہ کی ریا ہے؟۔

بعض اولیاء کو چند بار یہ اتفاق ہوا کہ اپنے حلقہ میں یا شیخ بہاء الدین "شیئاً للہ" کہا، ان کے ایک مرید نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا، حضرت نے فرمایا تم کیوں کہتے ہو؟ مرید نے کہا کہ آپ کہتے ہیں اس

لیے میں بھی کہتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ مجھ کو تو حضرت کی زیارت میسر آتی ہے، اس لیے یہ کہتا ہوں، مگر تو جو کہتا ہے کیوں کہتا ہے؟ غرض حضرت نے اس کو منع فرمایا اور اپنی اقتداء اور اتباع کی اس امر میں اجازت نہ دی، ایسے ہی جن صاحبوں نے وقت مذکور پر قیام کیا وہ مشرف بزیارت ہوئے تھے، عوام کو ان کا اقتداء جائز نہیں۔

باقی یہ کہنا کہ ہم بغرض تعظیم اسم مبارک کھڑے ہوتے ہیں، یہ ایسی بے ہودہ بات ہے کہ کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا، کیا اسی وقت آپ مستحق تعظیم ہوتے ہیں؟ اس سے آگے پیچھے ان لوگوں کے نزدیک مستحق تعظیم نہیں ہوتے؟ افسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر انوار کو ایسی ایسی واہیات سے ناواقفوں نے خراب کر دیا، اس لیے اپنا یہ قول ہے کہ ہمارے لیے تو مولود شریف اگر کریں جائز بلکہ مستحب ہے، پر رواج کے موافق کرنے والوں کے حق میں جائز نہیں، ہاں گوشۂ تنہائی میں بے قیام کوئی کبھی بتقاضائے محبت، بروایات صحیحہ پڑھ لیا کرے تو سبحان اللہ! پر ان روایات ضعیفہ موضوعہ کا پڑھنا یوں بھی جائز نہیں۔

غرض اصل سے ذکر بابرکات حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم عمدہ حسنات میں سے تھے، گو ذکر احکام اور استماع احکام بغرض اطاعت وتبلیغ حقیقت میں ذکر ملک علام ہے، مگر جیسے تنجن و زعفران وغیرہ اطعمہ لذیذہ اصل سے عمدہ غذا ہوتی ہے، پر زہر مل جائے تو باوجود عمدگی خراب ومہلک ہوجاتی ہیں اور اس وقت بوجہ اختلاط زہر باوجود لذت معلومہ اس لذت کا ترک ضروری ہے، چہ جائیکہ بوجہ لذت زہر مخلوط کا کھانا عمدہ سمجھا جائے، ایسے ہی ذکر خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم متضمن ولادت ہو یا متضمن وفات عمدہ خیرات میں سے ہے، پر بالائی خرابیوں کے باعث واجب الاحتراز ہے، چہ جائیکہ خرابی ہائے مذکورہ بوجہ عمدگی سفوہ واجب الارتکاب ہوں۔

لیجئے نواب صاحب! آپ کی خاطر یہ دو ورق سیاہ کرڈالے ہیں، پر دیکھئے اس نامہ سیاہ کے حق میں اس تحریر کے باعث کیا کیا صلوٰتیں ادھر سے پیش ہوتی ہے۔

مولوی عبدالکریم صاحب کی خدمت میں بعد سلام یہ عرض ہے کہ عنایت نامہ پہنچا، اس تفقد احوال کا شکریہ کیا ادا کروں اور اپنا حال لکھوں تو کیا لکھوں؟ دو دن تو اوروں کی دعا سے کچھ آرام سے گزرتی ہے تو دو دن اپنی شامت اعمال سے، پھر تکلیف کوئی نہ کوئی کھڑی ہوجاتی ہے، اب آج کل اللہ کا شکر ہے کہ تخفیف ہے، چند روز پہلے بہ شدت گزری، اس وجہ سے بھی جواب نامہ نواب صاحب ونیز جواب عنایت نامہ سامی میں دیر ہوئی، یا وہ دن تھے کہ ورق دو ورق ایک بات تھی، یا یہ دن ہیں کہ جواب خطوط بھی دشوار ہے، پہلے گھنٹہ دو گھنٹہ کی تقریر کو میں کچھ نہیں سمجھتا تھا اور اب بعض اوقات دو چار جملوں کا ادا کرنا بھی ایک مہم عظیم ہوجاتی ہے، اب آپ کے شاگردوں اور احباب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

❁❁❁❁❁

شوگر ختم

جو لوگ شوگر کے مرض میں مبتلا ہوں وہ اب مایوس نہ ہوں، قدرت نے ہر بیماری کے ساتھ اس کا علاج بھی پیدا کیا ہے، ہمارے دیسی علاج سے شوگر کا مرض ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا ہے اور دوبارہ اس کا حملہ نہیں ہوتا، شوگر کے وہ مریض جو انگریزی دوائیں کھاتے کھاتے پریشان ہوگئے ہوں اور آرام نہیں ہوتا تو وہ علاج کے لیے آج ہی ہمیں لکھیں، ملیں یا فون پر رابطہ کریں۔

مایوسی کی ضرورت نہیں

بواسیر- پتھری- پورے بدن کا درد- گٹھیا- سانس کا پھولنا

اس کے علاوہ

زنانہ ومردانہ پوشیدہ امراض کا مکمل کامیاب علاج

کمزوری چاہے کسی بھی عمر میں ہو

شادی سے پہلے یا بعد میں کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کریں۔

فون نمبر: 05922-250995
موبائل: 09412391643

پھول والے حکیم

محلّہ ملانہ، امروہہ، ضلع جے۔ پی۔ نگر
(یو۔ پی) 244221

اشتہار

سیرت وکردار

پانچویں اور آخری قسط

مسلم خواتین کے سچے واقعات

محمد شیث ادریس تیمی دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر دہلی

عقل خداداد کی زد:

اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی شادی سب سے پہلے جعفر بن ابوطالب رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی، ان کے بعد وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حبالہ عقد میں آئیں اور جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو علی رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کرلیا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ اسماء رضی اللہ عنہا کے لڑکے محمد بن جعفر اور محمد بن ابوبکر مفاخرت کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

ابن جعفر: ''میں تم سے بہتر ہوں اور میرے والد تمہارے والد سے افضل ہیں''۔

ابن ابوبکر: ''میں تم سے برتر ہوں اور میرے ابو تمہارے ابو سے اعلی ہیں''۔

اتفاق سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ وہاں موجود تھے، وہ اسماء سے کہتے ہیں۔

علی رضی اللہ عنہ: اسماء! تم ان دونوں کا جھگڑا طے کرو۔

اسماء: ''میں نے سارے عرب میں جعفر سے بہتر نوجوان نہیں دیکھا اور نہ کسی کو ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا شریف و بزرگ پایا''۔

علی رضی اللہ عنہ: ''تم نے تو میرے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں''۔

تمہارا اسلام میرا مہر ہے:

مال وزر سے محبت اور اس کی چاہت دور جدید کی عورتوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے، ان کے نزدیک یہ سوال فضول ہے کہ دولت کیسے اور کہاں سے آئی؟ لیکن اسلام کے سایہ میں پروان چڑھنے والی خواتین کی زندگیاں اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہیں، ان کا شعور ووجدان سیم وزر سے خیرہ نہیں ہوتا تھا، ان کے دل میں عقیدۂ ایمان کی عظمت راسخ تھی اور ان کا ایک ایک قدم اشاعت اسلام کے لیے اٹھتا تھا، ام سلیم کو تاریخ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں مالک بن نضر سے بیاہی تھیں، مالک ہی سے انس بن مالک پیدا ہوئے، ام سلیم جب اسلام لے آئیں تو مالک غصہ کے مارے شام چلا گیا اور وہیں مرگیا، اس کے بعد ابوطلحہ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا جو ابھی حالت کفر ہی میں تھے، ام سلیم نے جواب دیا:

ام سلیم: ''تمہارے پیغام سے مجھے دلچسپی ہے، تم جیسے معزز شخص کا پیغام کیسے رد کیا جاسکتا ہے، لیکن یہاں پر سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ میں مسلمان عورت ہوں اور تم کافر ٹھہرے اور ایک مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کافر مرد سے شادی کرے''۔

ابوطلحہ: ''میری طرف آپ کا میلان خاطر کی کوئی وجہ؟''۔

ام سلیم: ''کوئی وجہ نہیں''۔

ابوطلحہ: ''آپ کی دلچسپی کی وجہ سونے چاندی کا ڈھیر تو نہیں ہے؟''۔

ام سلیم: ''سونا چاندی اور مال ودولت کی مجھے ادنی بھی خواہش نہیں ہے، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم ایسے بتوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ کچھ سن سکتے ہیں اور نہ تم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، ان کو پوجتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی جن کو ایک حبشی نے گھڑا ہے، اگر تم حلقہ بگوش اسلام ہو جاؤ تو یہی میرا مہر ہے''۔

ابوطلحہ: ''ٹھیک ہے، میں غور کروں گا''۔

ابوطلحہ کچھ ہی دیر بعد واپس آجاتے ہیں اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرلیتے ہیں، پھر ان کی شادی ہوجاتی ہے۔

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں:

فاضل مکتب حراء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کما حقہ تعریف وتوصیف حیطۂ بیان سے باہر ہے، کیونکہ یہ فن اس پر خار اور دشوار گزار راہ سے عبارت ہے جس پر ادنی بے احتیاطی بھی چاک دامانی یا متاع دین وایمان گنوانے کے مترادف ہے، تاہم گیسوئے سیرت کو سنوارنے اور جمال محمدی کے خدوخال بیان کرنے میں ام معبد خزاعیہ کی فکر رسا اور مؤثر اسلوب بیان نے جو کمال دکھایا ہے وہ سراپائے احمدی کی حقیقی عکاسی کے ساتھ ساتھ ادب اسلامی کا گراں قدر سرمایہ اور اعلی شاہ کار ہے، واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہے تھے تو دوران سفر آپ کا گزر ام معبد خزاعیہ کے خیمے سے بھی ہوا، وہ نہایت شریف اور مہمان نواز خاتون تھیں، آپ نے ان سے پوچھا۔

رسول اللہ ﷺ: ''آپ کے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟''۔

ام معبد: ''اس قحط کے زمانے میں کھانے کے لیے کیا ملے گا؟ بکریاں بھی دور دراز جنگل میں چرنے گئی ہیں، اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو آپ لوگوں کی بھرپور ضیافت کرتی''۔

اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ خیمہ کے قریب بیٹھی ہوئی ایک بکری پر پڑی، آپ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''یہ کیسی بکری ہے؟''۔

ام معبد: ''شدید لاغری کے سبب ریوڑ کے ساتھ جنگل نہ جاسکی''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''اس میں تھوڑا بہت دودھ تو ہوگا''۔

ام معبد: ''دودھ کیا ہوگا؟ وہ تو حد درجہ کمزور ہے''۔

رسول اللہ ﷺ: ''کیا مجھے اس کو دوہنے کی اجازت ہوگی؟''۔

ام معبد: ''کیوں نہیں؟ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اگر اس میں دودھ دکھائی دے رہا ہو تو آپ اسے ضرور دوہ لیں''۔

اجازت مل جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کا دودھ دوہنا شروع کر دیا، دیکھتے ہی دیکھتے برتن بھر گیا، پہلے ام معبد کو پلایا، پھر دوسروں کو سیراب کیا اور اخیر میں خود نوش فرمایا، اس کے بعد آپ دوبارہ برتن بھر دودھ دوہ کر ام معبد کے پاس چھوڑ دیا، شام کو جب ابو معبد بکریاں چرا کر گھر لوٹا تو وہ اس قدر دودھ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اس نے ام معبد سے دریافت کیا، ابو معبد ''اتنا سارا دودھ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ اس بیمار بکری میں تو دودھ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا''۔

ام معبد: ''ادھر سے ایک برگزیدہ انسان کا گزر ہوا ہے، اللہ کی قسم! یہ اسی کی برکت ہے''۔

ام معبد نے ابو معبد کو ساری داستان سنائی، ابو معبد کی بے قراری بڑھ گئی، ام معبد سے دریافت کیا۔

ابو معبد: ''ذرا اس مقدس ہستی کا حلیہ تو بیان کرو''۔

ام معبد: ''چمکتا رنگ، دمکتا چہرہ، مناسب ساخت، پسندیدہ خو، نہ فربہی کا عیب، نہ لاغری کی خامی، نہ نکلا ہوا پیٹ، نہ گرا ہوا سر کا بال، چہرہ آفتاب، جسم تنومند، موزوں پیکر، سرگیں آنکھیں، پتلیاں کالی، ڈھیلے بہت سفید، گھنی دراز پلکیں، ابرو باریک اور ملے ہوئے، گردن لمبی، داڑھی گنجان، گھنگھریالے سیاہ بال، آواز میں کھنک کے ساتھ لطافت، کلام شریں اور واضح، نہ کم سخن، نہ بسیار گو، انداز بیان ایسا کہ گویا لڑی سے موتی جھڑ رہے ہوں، دور سے بلند آہنگ اور قریب سے دل فریب، خاموش ہوں تو پروقار، گفتگو کریں تو پرکشش، نہ ایسا پست قد کہ نگاہ کو نہ بھائے، نہ ایسا لمبا کہ بدنما لگے، دو نرم ونازک شاخوں کے درمیان ایک خوش منظر شاخ تازہ، لوگوں میں بیٹھیں تو سب سے پرکشش، دور سے نظر ڈالیں تو بہت بارعب، رفقا ان کے گرد حلقہ بنائے ہوئے کچھ فرمائیں تو سراپا گوش ہو جائیں، حکم دیں تو لپک کر بجالائیں، معتدل مزاج، نہ ترش رو نہ لغو گو''۔

ابو معبد: ''یہ تو وہی قریش والے ہیں، جن کے بارے میں لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائی ہیں، کوئی سبیل نکلے تو میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی رفاقت اختیار کروں گا''۔

کچھ دنوں بعد دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے، اور دولت ایمان ویقین سے دامن مراد بھر لیا۔

وقت کی آواز

عربی مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری تقاضے

مولانا ندیم الواجدی صاحب قاسمی مدیر ماہنامہ ''ترجمان دیوبند'' دیوبند

دینی مدارس میں اس وقت عام طور پر جو نصاب تعلیم پڑھایا جارہا ہے اسے درس نظامی کہتے ہیں، یہ نصاب ملا نظام الدین سہالویؒ نے اپنے زمانے کے مزاج اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا تھا، بعد کے لوگوں نے بھی اسے قبول کیا، کچھ نے کسی تبدیلی کے بغیر اور کچھ نہ ضروری تبدیلیوں کے ساتھ، جس وقت ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا اس وقت اس نصاب کی ترتیب وتدوین پر تقریباً ڈھائی سوسال گزر چکے تھے، قاعدے میں تو ہمارے بزرگوں کو ایک نیا نصاب بنانا چاہئے تھا اور اسے ہی رائج کرنا چاہئے تھا کیونکہ جن حالات میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا گیا وہ ان حالات سے یک سر مختلف تھے، جن حالات میں ملا نظام الدین سہالوی نے زندگی گزاری، اس کے بجائے ان حضرات اکابر نے درس نظامی کو بہ طور نصاب اختیار کیا، اس کی ایک وجہ تو بالکل ظاہر ہے کہ دراصل ماضی قریب تک یہی نصاب پڑھایا جارہا تھا، دل ودماغ اس سے مانوس تھے اور جو علماء بھی موجود تھے وہ اسی نصاب کے پروردہ تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ جس خونیں انقلاب کے پس منظر میں اس عظیم ادارے کی بنیاد پڑی، اس کا تقاضہ یہ تھا کہ کچھ نیا کرنے کے بجائے پرانی روش ہی اختیار کی جائے، دشمن بڑا ہوشیار تھا، وہ ذرا سی تبدیلی کو بھی محسوس کرسکتا تھا، درس نظامی کے متعلق اس وقت یہ عام رائے تھی کہ یہ کوئی دینی نصاب نہیں ہے، اس میں زیادہ تر کتابیں فلسفہ ومنطق اور ہیئت وغیرہ کی ہیں اور دینیات کی جو چند کتابیں ہیں وہ بھی فلسفیانہ موشگافیوں سے بھری پڑی ہیں، پورے نصاب میں چالیس کے قریب کتابیں تھیں، آٹھ سال کے اس کورس میں صرف دو کتابیں ایسی تھیں جن کو ہم براہ راست دین سے متعلق کہہ سکتے ہیں، دیکھا جائے تو یہ نصاب حکومت مخالف کم، حکومت معاون زیادہ تھا، کیونکہ اسے پڑھنے والوں ہی کو عموماً سرکاری ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے منتخب کیا جاتا تھا، اس طرح حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اوران کے رفقائے کرام نے عنوان تو درس نظامی کا اختیار کیا لیکن اس میں آہستہ آہستہ کچھ ایسے تغیرات بھی کئے جن کی وجہ سے یہ نصاب ایک نئی شکل اختیار کرگیا، علماء کے ذوق اور زمانے کے رجحان کی وجہ سے فلسفہ ومنطق سے پیچھا تو نہیں چھڑایا جاسکا، لیکن ان علوم کے شانہ بشانہ حدیث، فقہ اور تفسیر کے علوم بھی شامل کردیئے گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نصاب کوئی جامد چیز نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوسکے، بلکہ یہ ایک متحرک شئ ہے، اس کی مسلسل حرکت ہی سے تعلیم کو تحریک ملتی ہے، اگر نصاب کو ناقابل تغیر چیز سمجھا گیا ہوتا تو ہم آج تک ملا نظام الدین کے زمانے ہی کی تمام کتابیں پڑھ پڑھا رہے ہوتے۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیم وتربیت کے باب میں نصاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نصاب تعلیم ایک سانچہ ہے، اسی سانچے کے مطابق طلبہ کے دل ودماغ اور ذہن وفکر ڈھلتے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ نصاب میں تعلیم کے بنیادی مقاصد کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کا بھی لحاظ رکھا جائے، بلاشبہ ہمارے مدارس کا نصب العین نہایت بلند اور ارفع واعلی ہے اور وہ ہے دین کی حفاظت اور اس کی اشاعت، اس بلند نصب العین کے حصول

کے لیے لازم ہے کہ ہم جس دور میں سانس لے رہے ہوں اس دور کی حسیات اور اس زمانے کے تقاضوں اور ضرورتوں پر ہماری گہری نظر ہو، اس کے بغیر ہم اپنا نصب العین پورے طریقہ پر حاصل نہیں کر سکتے، یہ عجیب بات ہے کہ ہم نے نصب العین کو تو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس نصب العین تک پہنچنے کا جو ذریعہ اور وسیلہ ہے یعنی نصاب اسے ہم آسمانی طریقہ تصور کرنے لگے ہیں اور اسے ہی اصل مقصد سمجھ بیٹھے ہیں، صورت حال یہ ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے ہم ایک ہی راستے پر چلتے چلے جارہے ہیں جب کہ منزل تک پہنچنے کے لیے ہمارے سامنے دوسری راہیں بھی کشادہ ہیں جو اس راستے سے زیادہ آسان بھی ہیں اور کم وقت میں منزل تک پہنچانے والے بھی ہیں اور ان میں دل و دماغ اور ذہن وفکر کی بالیدگی کے لیے خوبصورت اور دل چسپ مناظر بھی ہیں، جب بھی کوئی راستے میں تھوڑی سی تبدیلی لانے کی یا اسے دلچسپ اور خوش گوار بنانے کی بات کرتا ہے تو ایک بڑا طبقہ اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس طرح ہمارے مدارس کا نصاب تعلیم مادحین وناقدین کے درمیان بحث کا موضوع بنا ہوا ہے اور دونوں ہی اس بحث میں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ نصاب تعلیم کے حوالے سے ہمارے یہاں دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں، ایک بڑا طبقہ تو وہ ہے جو اس نصاب کو منزل من اللہ سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ یہ نصاب بہت سوچ سمجھ کر اختیار کیا گیا ہے، اس کا ایک ایک مضمون اپنی جگہ مکمل اور اس میں شامل ایک ایک کتاب اپنی جگہ ناقابل تغیر ہے، اس نصاب کو پڑھ کر ہی ہمارے اکابر جبال علم بنے اور آج ان کی علمی اور دینی خدمات سے ساری دنیا فیض اٹھا رہی ہے، یہ وہ طبقہ ہے جو مروج نصاب تعلیم میں کسی ادنی تبدیلی کو بھی برداشت کرنے کا روا دار نہیں ہے، اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ ہے جو مدارس کے پورے نصاب ونظام ہی کو غرق مے ناب کرنے پر آمادہ رہتا ہے، اس کا خیال ہے کہ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے اور ہم آج بھی سینکڑوں سال پرانے نصاب کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان مدارس سے نکلنے والے طلبہ وعلماء نہ عصری زبانیں جانتے ہیں اور نہ انہیں عصری علوم سے کوئی واقفیت ہے، اس گروہ کے خیال میں پورے نظام مدارس کو مکمل طور پر بدلنے کی ضرورت ہے اور نصاب میں ایسے علوم شامل کرنے کی ضرورت ہے جو یہاں کے فارغین کو عصری درسگاہوں کے فارغین کے برابر لاسکیں اور انہیں روزگار کے مواقع فراہم کرسکیں۔

ہمارے خیال میں یہ دونوں طبقے افراط وتفریط کا شکار ہیں، وہ طبقہ بھی جو نصاب کو الہامی قرار دے کر اسے کچھ اس طرح مقدس سمجھتا ہے کہ اس میں ذرا سی تبدیلی بھی، یا تبدیلی کی بات بھی اس کے نازک جذبات کو مجروح کر دیتی ہے اور وہ طبقہ بھی جو اس پورے نصاب ہی کو فرسودہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے اور خود کو کچھ زیادہ ہی تجدد پسند اور عصری آگہی کا حامل تصور کرتا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ نصاب نہ اس قدر مقدس ہے کہ اسے ہاتھ لگانا بھی گناہ قرار دیا جائے اور نہ اس قدر بیکار کہ اسے کسی قیمت پر گوارا نہ کیا جائے، افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ اس نصاب کی اصل روح اور بنیادی کردار کو باقی رکھتے ہوئے کچھ اس طرح کی تبدیلیاں کی جائیں کہ یہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائے، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں اعتدال پسندوں کی بھی کمی نہیں ہے، یہ حضرات زبان وقلم کے ذریعہ وقتاً فوقتاً اپنا نقطہ نظر پیش کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کے خیالات کو کبھی اعتناء نہیں سمجھا جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نظام مدارس میں جو لوگ حاوی ہیں ان کا تعلق پہلے ہی طبقے سے ہے، اس لیے جب بھی اعتدال پسندی کے ساتھ کوئی مشورہ پیش کیا جاتا ہے تو اسے انتہائی حقارت کے ساتھ فوراً ہی ٹھکرا بھی دیا جاتا ہے اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہمیں گاؤں دیہات کے لیے ایسے مولویوں کی ضرورت ہے جو مسجدوں میں ائمہ ومؤذنین کے فرائض انجام دے سکیں اور عام مسلمانوں کی نمازیں درست کرا سکیں اور اس کام کے لئے یہ نصاب کافی وافی ہے، نہ اس میں عصری علوم کی شمولیت کی ضرورت ہے اور نہ

کسی دوسری تبدیلی کی، اگر یہ دلیل ہے تو اس کے مہمل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ائمہ ومؤذنین وغیرہ کے ساتھ ساتھ ایسے علماء کی بھی ضرورت ہے جو بدلے ہوئے حالات میں اسلام کے داعیانہ کردار کی تشریح وتوضیح کا فرض انجام دے سکیں، نمازوں کی درستگی اوراصلاح کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ذہنی اور فکری تربیت بھی بہت ضروری ہےاوراس کے لیے ایسے علماء کا وجود میں آنا وقت کا تقاضہ ہے جن کی معلومات بھی وسیع ہوں اور جن کی بصیرت بھی نمایاں ہواور جو زیرتربیت افراد کے ساتھ ان ہی کی زبان میں اوران ہی کی ذہنی اور فکری سطح کے مطابق ہم کلام ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں، بلاشبہ ائمہ اورمؤذنین ہمارے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، مگران کے لیے کسی دینی ادارے میں آٹھ دس سال کا نصاب پورا کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ اپنے منصبی فرائض دو چار سال کی تعلیم وتربیت کے بعد بھی انجام دے سکتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ بھی اسی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں بھی اس دنیا میں جینا اور مرنا ہے، آخران پر دنیا کے راحت وآرام کے دروازے کیوں بند کئے جاتے ہیں، اگرعصری علوم کے ضروری اضافے سے کچھ فارغین کو معاشی اوراقتصادی ترقی کے مواقع مل رہے ہوں تو ان کوان مواقع سے محروم رکھنے کے لیے آپ کے پاس کیا شرعی جواز ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح فارغ طلبہ معاشیات میں لگ جائیں گے، دعوت وتبلیغ اوردرس وتدریس کا کام کون کرے گا، اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ محض تصوراتی چیز ہے کہ تمام فارغ طلبہ دین کو خیر باد کہہ کر دنیا میں منہمک ہوجائیں گے، نہ سب کی صلاحیتیں یکساں معیار کی ہوتی ہیں اور نہ سب کے طبعی میلانات ایک جیسے ہوتے ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کا رخ ایک ہی طرف ہو، یقیناً کچھ لوگ درس وتدریس میں لگیں گے، کچھ دعوت وتبلیغ کا شعبہ منتخب کریں گے، کچھ دوسرے میدان کا انتخاب کریں گے، کیا یہ خوش آئند بات نہیں ہے کہ ہمارے مدارس کے فارغین بھی زندگی کے ہرشعبے میں نظر آئیں، اس وقت وہ صرف مسجدوں اور مدرسوں میں نظر آتے ہیں کیونکہ یہ ان کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی، جس تعداد میں ہمارے مدارس سے طلبہ فارغ ہورہے ہیں، اس رفتار سے مسجدوں اور مدرسوں میں افراد کی ضرورت پیش نہیں آرہی ہے، اس لیے مدارس میں کرپشن بڑھ رہا ہےاوراس کی صورت یہ ہورہی ہے کہ فارغ طلبہ اپنی معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مدرسوں پر مدرسے قائم کئے چلے جارہے ہیں اور یہ کام ہربستی اور ہرشہر میں پوری رفتار سے ہورہا ہے، مدرسوں کوخودرو پودوں کی طرح اگتے ہوئے دیکھنا ہوتو دیوبند میں آکر دیکھ لیجئے جہاں اس وقت ڈیڑھ سو سے زیادہ مدرسے قوم کی خدمت انجام دینے میں مصروف ہیں۔

نصاب تعلیم کے سلسلے میں معتدل نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسے مدارس کے نصب العین، حفاظت دین اور اشاعت دین کو سامنے رکھ کرعصری ضرورتوں کے لحاظ سے مفید بنایا جائے، اس نظریئے کے حامل افراد وقتاً فوقتاً اپنے خیالات پیش کرتے رہتے ہیں، راقم السطور کے نزدیک اس سلسلے میں پہلی باضابطہ مدلل اور بھرپور تحریر آج سے پینتیس چالیس برس پہلے حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے قلم سے نکلی تھی لیکن ایک تجربہ کار، مستند اور قدیم طرز کے عالم کی تحریر ہونے کے باوجود ان کی تجاویز کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا، اسکی وجہ یہی ہے کہ ہمارے مدارس کے نظام پر تغلب اسی طبقے کا ہے جو قدیم روش سے معمولی انحراف کو بھی دین سے انحراف سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے، اگران کا یہ طریقۂ کار زندگی کے ہرشعبے میں ہوتو بھی ہمارے لیے تسلی کا سامان موجود ہے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا یہ تصلب اور تشدد صرف مدارس کے نظام اور نصاب تک محدود ہے، باقی شعبہائے زندگی میں ان کا نقطۂ نظر ہم دوش ثریا ہے تو ہمیں حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور اسی احساس نے ان سے یہ گراں قدر

مضمون لکھوایا جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اس مضمون میں انہوں نے لکھا ہے کہ مدارس عربیہ کے لیے ایک جدید نصاب تعلیم کی ضرورت ہے جو مندرجہ ذیل خطوط پر مبنی ہونا چاہئے۔

(الف) تخفیف: یعنی نصاب مختصر ہو، اس نصاب سے فراغت اور اس کے ذریعہ حصول علم میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔

(ب) تیسیر: یعنی نصاب میں وہ کتابیں شامل ہوں جو سہل وسلیس زبان میں ہوں، پیچیدہ اور دقیق نہ ہوں۔

(ج) محو واثبات یا اصلاح وترمیم: یعنی بعض غیر اہم فنون کو ہٹا کر جدید ومفید علوم کا اضافہ۔

حضرت مولاناؒ نے پہلے نقطے کی تشریح اس طرح کی ہے کہ نصاب جس قدر مختصر ہوگا اسی قدر طلبہ میں حصول علم کا جذبہ زیادہ ہوگا، یہ صحیح ہے کہ مختصر نصاب سے بعض اوقات ہر طبیعت پوری طرح مستفید نہیں ہو سکے گی؛ لیکن اس کی تلافی کے لیے ایک مشترک عام نصاب کے بعد مختلف علوم وفنون میں تکمیل وتخصص کے درجات قائم کئے جا سکتے ہیں، جس طالب علم کو جس فن سے زیادہ مناسبت ہوگی وہ اس فن میں مہارت حاصل کرے گا، حضرت مولانا نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ مختلف ضرورتوں کے پیش نظر الگ الگ نصاب بھی بنائے جانے چاہئیں، مثال کے طور پر مدرس عالم کے لیے ایک نصاب ہونا چاہئے، ماہر خصوصی کے لیے الگ نصاب کی ضرورت ہے، صرف دینی ضرورت کے لیے عالم بننے کا نصاب الگ سے بنایا جائے، اب صورت حال یہ ہے کہ ایک ہی نصاب ہر شخص پڑھ رہا ہے، وہ شخص بھی جسے مدرس بننا ہے، وہ شخص بھی جیسے تجارت وغیرہ میں مشغول ہونا ہے اور وہ بھی جسے امام یا مؤذن بن کر قوم کی خدمت میں مصروف ہونا ہے، ظاہر ہے جس طالب عالم کو پڑھنے کے بعد مدرس بننا ہے اس کا نصاب اس طالب علم سے مختلف ہونا چاہئے جس کو تجارت یا زراعت میں مشغول ہونا ہے اور اس کے مقابلے میں اس طالب علم کا نصاب بھی جداگانہ ہونا چاہئے جسے پڑھنے کے بعد امامت یا مؤذنی کی ذمہ داری سنبھالنی ہے، ان نصابہائے تعلیم میں کچھ چیزیں مشترک بھی ہوں گی اور کچھ طلبہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف بھی۔

دوسرا نقطہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے اور انتہائی قابل توجہ بھی، اس نقطے کے بارے میں حضرت مولانا کی رائے یہ ہے کہ ہر زمانے کا ایک خاص مزاج اور خاص ذوق ہوتا ہے، ہمارے نصاب تعلیم میں جو کتابیں شامل ہیں ان میں زیادہ تر کتابیں اسلام کے دور انحطاط کی یادگار ہیں، اس زمانے میں کمال تالیف کا معیار قواعد کی تلخیص، مسائل کی تنقیح، عبارت آرائی، متن نویسی، ایجاز واختصار کے لیے نئے نئے اسالیب کی ایجاد اور لفظی موشگافی وغیرہ کو سمجھا گیا، یہی چیزیں علمی مسابقت کا میدان بھی بن گئیں، منظوم قواعد تیار ہونے لگے، مبادی ووسائل مقاصد بن گئے، مثال کے طور پر علوم عربیت (صرف ونحو وغیرہ) کا مقصد قرآن وحدیث کی لغوی، ترکیبی اور اعرابی مشکلات کا حل تھا؛ لیکن آگے چل کر یہ مقصد پس منظر میں جا پڑا اور جو علوم بطور مبادی پڑھائے جا رہے تھے وہی مقاصد بن گئے، قرآن وحدیث کی تراکیب پر دھیان کی فرصت ہی نہ رہی بلکہ خود ان کتابوں کے مسائل اور عبارات کا حل ہی تمام تر توجہات کا مرکز بن گیا، ابن حاجب کی کافیہ ہی کو لیجئے، یہ اس قدر مشکل کتاب ہے کہ اس کو حل کرنے کے لیے پچاس سے زیادہ شروحات لکھی جا چکی ہیں، ان میں سے ایک شرح ''شرح ملا جامی'' بھی ہمارے نصاب کا جزو ہے، یہ شرح کافیہ کے مغلقات تو کیا حل کرتی خود ہی چیستاں بن کر رہ گئی، جو طلبہ گذشتہ سال کافیہ میں سر کھپا رہے تھے وہی طلبہ دوسرے سال اس کتاب کی شرح میں مغز ماری کرتے نظر آتے ہیں، شرح جامی کی مشکل پسندی کا عالم یہ ہے کہ اس کی شروح وحواشی لکھنے میں اہل علم نے اپنی عمریں کھپا دیں، اس کتاب کی ایک شرح ہے ''عبدالغفور'' اس سے مقصد حل نہ ہوا تو عبدالحکیم سیالکوٹی نے ''تکملہ'' لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی، اس سے بھی بات نہیں بنی تو ان دونوں کی شرح ''دافع التوہمات'' لکھی گئی، اسی طرح ابن مالک کی الفیہ ہے، یہ بھی فن نحو میں مشکل کتاب

ہے، اس کی مشکلات حل کرنے کے لیے شرح اشمونی لکھی گئی، مگر یہ شرح الفیہ کے غوامض پورے طور پر حل نہ کرسکی تو ایک باہمت شخص نے سات ضخیم جلدوں میں ''صبان'' کے نام سے اس شرح کی شرح لکھ ڈالی بات صرف نحو وصرف تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ فقہ اسلامی جیسے اہم ترین موضوع کی کتابیں بھی عبارت آرائی اور دقت پسندی کے رجحان سے دور نہ رہ سکیں، مثال کے طور پر کنز الدقائق ہی کو لیجئے اس کے ایک ایک لفظ میں کئی کئی فقہی مسئلے سموئے گئے ہیں۔

اب یہ استاذ کے کمال علم پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح اس لفظ سے مسائل کا استخراج کرتا ہے اور طالب علم کے کمال ذہانت پر موقوف ہے کہ وہ کس طرح ان مسائل کو سمجھتا ہے اور دماغ میں محفوظ رکھتا ہے، نصاب تعلیم میں تفسیر کی صرف دو کتابیں داخل ہیں، تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین، دونوں ہی کتابیں مغلق تصور کی جاتی ہیں، ثانی الذکر کے اختصار کا عالم یہ ہے کہ اس کی تفسیر کے الفاظ قرآن کریم کے کلمات سے کم ہیں، باقی علوم وفنون کی کتابوں کا حال بھی یہی ہے، جب کہ ہر موضوع پر ایسی کتابیں موجود ہیں جو موجودہ کتابوں کا نعم البدل بن سکتی ہیں، مگر اس کو کیا کہا جائے کہ مشکلات میں سر کھپانے کو درس وتدریس کی معراج سمجھ لیا گیا ہے، آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ مشکلات کو مزید مشکل بنانا اور الجھے ہوئے مسائل کو مزید الجھانا کمال ہے یا مشکلات کو آسان تر بنا کر پیش کرنا کمال ہے، ظاہر ہے کہ آپ اسی دوسرے سوال پر ہاں کریں گے، اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہے تو آج بھی ہمارے مدارس فلسفہ، منطق اور کلام کی مشکل کتابوں کی دقیق ترین بحثوں میں کیوں الجھے پڑے ہیں جب کہ ان سے بہتر اور آسان کتابیں موجود ہیں، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے رسائل، محک النظر، معیار العلم، مقاصد الفلسفہ اور الاقصاد فی الاعتقاد جیسی کتابوں کے ذریعہ وہ مہارت پیدا ہوسکتی ہے، جو بہ مشکل تمام ان بڑی دقیق اور طویل کتابوں سے حاصل ہوگی، غزالی کی حسن تعبیر اور کمال تفہیم تو اہل علم کے یہاں مسلمات میں سے ہے، امام رازی کو منطق اور فلسفہ کا سب سے بڑا امام تسلیم کیا جاتا ہے مگر ان کی کتابیں داخل درس نہیں ہیں، حالانکہ ان کی کتابیں زبان وبیان کے اعتبار سے بھی نہایت شگفتہ وسلیس ہیں اور معنی ومفہوم کے اعتبار سے بھی گرہ کشا اور دلچسپ ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ درس نظامی میں متقدمین کی کتابیں شامل کرنے کے بجائے متأخرین کی کتابیں شامل کی گئی ہیں جب کہ متقدمین کی کتابوں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ حسن تعبیر بھی ہے اور حسن تفہیم بھی جنہیں پڑھنا بھی اچھا لگتا ہے اور سمجھنا بھی سہل معلوم ہوتا ہے، اس کے برعکس متأخرین کی زیادہ تر کتابوں میں کاغذ بچانے ہی کو کمال گردانا گیا ہے، بلاشبہ انہوں نے کئی کئی صفحات کے مضامین ایک ایک صفحے میں سمودئے اور جو بات دس بیس سطروں میں ادا کرنی تھی وہ ایک دو سطر میں ادا کردی، اس کے علاوہ بتلایئے انہوں نے امت پر کیا احسان کیا، ایک مدرس بے چارہ گھنٹوں کتاب کے اسرار ورموز سمجھنے میں لگا تا ہے، اس کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھاتا ہے، اس کے باوجود حق ادا نہیں کرپاتا، یہی حال طلبہ کا ہے، شوقین اور محنتی طلبہ رات رات بھر خشک مضامین میں سر کھپا کر اپنی صحت برباد کرتے ہیں، حاصل یہ نکلتا ہے کہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، حضرت مولانا بنوریؒ نے لکھا ہے کہ اگر ہمارے مصنف ایک سطر کے مضمون کو دو صفحوں میں پھیلا دیتے اور اس طرح حل کرتے کہ وہ سرسری نظر میں ذہن نشین ہو جاتا تو کیا حرج تھا، بلاشبہ انہوں نے کاغذ، روشنائی کم خرچ کی، لیکن دماغ کا کچومر نکال کر رکھ دیا، اختصارات اور ایجازات سے کاغذ پر تو رحم کیا گیا لیکن دماغ جیسے لطیف جوہر اور وقت جیسے قیمتی سرمایہ کو بے رحمی کے ساتھ برباد کرڈالا، کیا غزالی، رازی، تقی الدین، ابن دقیق العید، عزالدین بن عبدالسلام، ابن تیمیہ، ابن القیم جیسے نابغۂ روزگار محققین ان چیستانوں کی بدولت ازکیائے امت میں شمار ہوئے ہیں، کیا ان بزرگوں کی کتابوں میں ان متأخرین یا قرون وسطی کی مشکل پسند طرز تعبیر کا کہیں پتہ چلتا ہے؟۔

تیسرا نقطہ بھی اہم ہے بلکہ باقی دونوں نقطوں سے زیادہ اہم ہے،

حضرت مولانا بنوریؒ یہ مانتے ہیں کہ جو علوم ہمارے مدارس میں پڑھائے جارہے ہیں وہ اس امت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں، اس سرمائے کی حفاظت بھی ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں کے دین اوران کے تمدن کی بقاء کا مدار ان علوم کی بقا پر ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اس طرح لازم وملزوم ہیں، جس طرح حیات جسمانی کے لیے روح انسانی کا وجود، بلکہ الحاد اور دہریت کے اس دور میں ان علوم کے تحفظ کی ضرورت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ گزشتہ چندصدیوں سے جو علمی نظام یا تعلیمی نصاب رائج ہے وہ امت کی موجودہ سمیت کے لیے تریاق نہیں بن سکتا، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو امراض پیدا ہوگئے ہیں ان کی شفایابی کے لیے قدیم نصاب تعلیم کافی نہیں ہے۔

علمی حلقوں میں یہ سوال اکثر اٹھتا رہتا ہے کہ کیا ہمارے مدارس کا نصاب تعلیم زمانے کی تیز رفتار ترقی کا ساتھ دے رہا ہے یا نہیں؟ اگر اس سوال پر شدت پسندی اور عصبیت کے تنگنائے سے باہر نکل کر غور کیا جائے تو جواب نفی میں ہوگا، ظاہر ہے ہم اس نصاب کو برسہا برس سے پڑھ رہے ہیں، اس میں جو علوم وفنون شامل ہیں وہ اس دور کے لحاظ سے یقیناً مفید تھے جس دور میں یہ نصاب اختیار کیا گیا تھا، بعد کے لوگوں نے بھی مناسب اضافے کرکے اسے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، مثال کے طور پر دارالعلوم دیوبند نے جب یہ نصاب اپنایا تو اس میں عقلی علوم کی کتابیں کم کرکے حدیث اور فقہ کی متعدد کتابیں شامل کیں، اس طرح اس نصاب کو نام تو درس نظامی کا دیا گیا مگر اس کے قالب میں فرنگی محل، خیرآباد اور دہلی میں رائج نصابہائے تعلیم کی روح کشید کر کے ڈال دی گئی، اس طرح یہ اس وقت کے لحاظ سے معتدل نصاب بن گیا، اکابر کے اس طرز عمل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے کہ نصاب تعلیم میں ضرورت کے تحت کمی بیشی کرنا قابل اعتراض بات نہیں ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب نصاب میں ایسی ہی کسی تبدیلی کا مشورہ دیا جاتا ہے تو بہت سی جبینیں شکن آلود ہوجاتی ہیں گویا کوئی بہت ہی غلط مشورہ دے دیا گیا ہو، ہم یہ مانتے ہیں کہ بعض حلقوں کی طرف سے غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کی جاتی ہے اور ارباب مدارس سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نصاب میں عصری علوم کا اضافہ کرلیں، عصری علوم سے ان کی مراد وہ علوم ہیں جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں، بلاشبہ یہ مطالبہ قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ مدارس خالص دینی اسلامی علوم کی ترویج واشاعت کے لیے قائم کئے گئے ہیں، عصری علوم کی تدریس کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں کافی ہیں، اس طرح کے علوم سے مدارس کے نصاب تعلیم کو بوجھل نہیں بنایا جاسکتا، تاہم نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں اس حد تک تبدیلی ضروری ہے جو تغیر پذیر دنیا کے تغیرات کا ساتھ دے سکے اور یہ نصاب پڑھنے والا ایک طرف دینی علوم میں پوری مہارت حاصل کرلے، دوسری طرف وہ جدید علوم سے بھی اس حد تک واقف ہو جائے جو معاشرے میں اس کے قائدانہ کردار کی اہمیت کو اجاگر کرسکے۔

ہم اپنی بات کی وضاحت اس طرح کرسکتے ہیں کہ ہمارے مدارس میں جو علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں وہ دو درجوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، ایک علوم عالیہ، دوسرے علوم آلیہ، اول الذکر سے مراد تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقائد وغیرہ ہیں، یہ علوم اعلی وارفع بھی ہیں کیونکہ ان کا تعلق قرآن وحدیث سے ہے اور مقصود بالذات بھی ہیں کیونکہ مدارس کی تمام تر جدوجہد انہی علوم کے حصول کے لیے ہے، ثانی الذکر سے مراد وہ علوم ہیں جو اول الذکر کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں، ان علوم میں اس لیے مہارت حاصل کی جاتی ہے تاکہ قرآن وحدیث سے متعلق علوم کی تحصیل اور تفہیم آسان ہوجائے، یہ علوم نحو وصرف، منطق وفلسفہ، حساب اور لسانیات وغیرہ ہیں، یہ علوم بذات خود مقصود نہیں ہیں، بلکہ علوم عالیہ کا مدار ہونے کی وجہ سے مقصود بن گئے ہیں، اگر قرآن وحدیث اور فقہ وکلام کی کتابیں ان کے بغیر سمجھ میں آجائیں تو ان علوم کی ضرورت ہی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ابتدائی

سالوں میں صرف ونحو میں خوب محنت کرائی جاتی ہے، منطق اور فلسفے کے مباحث بھی ذہن نشین کرائے جاتے ہیں تب جا کر کہیں تفسیر وحدیث کی بڑی کتابوں کا نمبر آتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علوم آلیہ کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے، یہ ذریعہ اور وسیلہ ہونے کی وجہ سے اہم ہیں، جہاں تک وسائل کا تعلق ہے، وہ ہر زمانے کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ضرورت کے تحت ان وسائل کو اختیار بھی کیا جاسکتا ہے اور ترک بھی کیا جاسکتا ہے، ان میں اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے اور کمی بھی کی جاسکتی ہے، ہوسکتا ہے کہ جس چیز کو ماضی کے کسی دور میں مفید سمجھا جاتا ہو، اب اس کی افادیت باقی نہ رہی ہو اور اب کوئی دوسری چیز زیادہ اہم اور مفید بن گئی ہو۔

لسانیات ہی کو لیجئے کہ کسی دور میں مفید سمجھا جاتا ہو اب اس کی افادیت باقی نہ رہی ہو اور اب کوئی دوسری چیز زیادہ اہم اور مفید بن گئی ہو، پہلے زمانے میں فارسی کا رواج تھا، کیونکہ اس ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی، اس لیے تصنیف وتالیف، خط وکتابت، مقدمات، یہاں تک کہ عام بول چال میں بھی یہی زبان استعمال کی جاتی تھی، آہستہ آہستہ یہ زبان ختم ہوتی چلی گئی، اس کی جگہ مادری زبان کی حیثیت سے اردو آ گئی اور عام رابطے کی حیثیت سے ہندی نے یا ہندوستانی نے لے لی جو بولنے میں تو اردو جیسی لگتی ہے لیکن دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، بین الاقوامی سطح پر رابطے کی زبان انگلش بن چکی ہے، مگر ہمارے مدارس نے ابھی تک فارسی زبان کا پیچھا نہیں چھوڑا، آج بھی نحو وصرف سکھلانے کے لیے جو کتابیں ہمارے یہاں داخل ہیں وہ فارسی زبان میں ہیں، طالب علم پہلے فارسی سیکھتا ہے، پھر فارسی زبان کے ذریعہ اسے عربی کے قواعد سکھلائے جاتے ہیں، بہ قول مولانا ابوالکلام آزاد اس کی ساری دماغی قوت تین خانوں میں بٹ رہی ہے، فارسی کا سمجھنا، عبارت کا حل کرنا اور عربی گرامر کو سمجھنا اور حل کرنا''۔(خطبات آزاد صفحہ ۳۲۱)

اب اگر ہم فارسی کی جگہ اردو زبان سکھلانے میں کچھ وقت لگائیں تو زیادہ بہتر نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں، اسی طرح ہمیں اس ملک کی سرکاری زبان بھی آنی چاہئے کیونکہ یہ سارے ہندوستان میں پڑھائی جارہی ہے اور اب مسلمانوں کا نوے فیصد طبقہ بھی اسکولوں، کالجوں میں یہی زبان پڑھ رہا ہے، اردو زبان کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ ہماری مادری زبان ہے اور ہمارے بزرگوں کے بہت سے علوم اس زبان میں ہیں اردو ہمارے مدارس کا ذریعہ تعلیم بھی ہے، فارسی ہماری مادری زبان نہیں ہے اور نہ اب وہ اردو کے مقابلے میں کوئی خاص اہمیت رکھتی ہے، اس کی تمام اہم کتابیں اردو میں منتقل ہوچکی ہیں، ہندی کی اہمیت یہ ہے کہ اس ملک کی حکومت کی زبان بھی ہے اور اکثر عوام کی زبان بھی، علماء کا اس زبان سے دور رہنا دعوتی کاموں کے لیے بھی نقصان دہ ہوسکتا ہے اور وہ اس زبان کے بغیر مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی بھی رہ نمائی نہیں کرسکتے، انگلش کی اہمیت اس لیے ہے کہ بین الاقوامی طور پر رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے، اس طرح علوم آلیہ کے ضمن میں ہمارے مدارس کو لسانیات پر بطور خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، عربی زبان تو مقصود بالذات ہے ہی کیونکہ تمام علوم عالیہ اسی زبان میں ہیں، اردو، ہندی اور انگریزی زبانیں بھی شامل نصاب کرکے پڑھائی جائیں تو ہمارے طلبہ عملی زندگی میں زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتے ہیں۔

جہاں تک نصاب میں انگریزی زبان کی شمولیت کا معاملہ ہے یہ ہمیشہ سے اختلاف کا موضوع بنا رہا، ہمارے مدارس میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو محض اس لیے انگریزی زبان کی مخالفت کرتا ہے کہ یہ انگریزوں کی زبان ہے اور اس زبان میں اس قوم کے اثرات نمایاں ہیں، اس طبقے کے افراد کا تجربہ یہ کہتا ہے کہ انگریزی سیکھنے والے طبقہ کی وضع قطع انگریزوں جیسی ہوجاتی ہے، دوسرا خوف اس طبقے کو یہ رہتا ہے کہ اگر ہمارے فارغین کو انگریزی آ گئی تو وہ مدارس کے کام کے نہیں رہیں گے اور حصول معاش کے لیے دوسری جگہوں کا رخ کر بیٹھیں گے، یہ دونوں باتیں نفسیاتی خوف پر مبنی ہیں:

اول تو عمومی طور پر ایسا ممکن نہیں ہے کہ انگریزی زبان سیکھنے والے تمام طلبہ انگریزی وضع قطع اختیار کرلیں، اگر ایسا ممکن ہوتا تو عصری تعلیم گاہوں میں ایک بھی شخص باشرع نظر نہ آتا، آج بھی علی گڑھ میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے طلبہ اور پروفیسر مل جائیں گے جنھوں نے ایک دن بھی کسی مدرسے میں نہیں گزارا مگر وہ اپنے حلیئے سے کسی باضابطہ عالم سے کم نہیں لگتے، پھر اگر مدارس کے طلبہ انگریزی سیکھنے کے بعد اپنا حلیہ تبدیل کردیتے ہیں تو اس میں قصور انگریزی زبان کا نہیں ہے بلکہ کمی اس تربیت کی ہے جو انہیں دی گئی ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ وہ انگریزی کی دو چار کتابیں پڑھ کر رنگ بدل دیتے ہیں، جب کہ اسلامیات کی سینکڑوں کتابوں کا ان پر گہرا اور پائیدار رنگ نہیں چڑھ پاتا، یہی حال انگریزی زبان سیکھنے والے طلبہ کی معاش کا ہے، اول تو تمام طلباء مدارس سے راہ فرار اختیار نہیں کرتے اور اگر کچھ طلبہ ایسا کرتے بھی ہیں تو کیا اچھا ذریعہ معاش اختیار کرنا کوئی جرم ہے؟ ہمیں تو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے فارغ طلبہ معاشی اعتبار سے بہتر ہونے کی کوشش کررہے ہیں اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ وہ جہاں کہیں بھی جائیں گے اپنے مقام ومرتبے کا خیال رکھیں گے، اس کے برعکس ہم انہیں پریشان حال دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور انہیں صرف مدرسوں اور مسجدوں میں قید رکھنا چاہتے ہیں، بہرحال یہ مغالطہ انگریزی ہے یا فریب خوردگی، آپ اسے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں، مگر عقل وانصاف کی بات نہیں کہہ سکتے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہمارے اکابر انگریزی زبان کو شجرہ ممنوعہ نہیں سمجھتے تھے، یوں بھی زبانیں کسی کی میراث نہیں ہوتیں اور نہ کسی کی جاگیر ہوتی ہیں، ضرورت کے تحت انہیں اپنایا بھی جاسکتا ہے، یہودیوں سے بڑھ کر مسلمانوں کا اور اسلام کا دشمن کون ہوسکتا ہے اس کے باوجود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت زید بن ثابت کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ یہودیوں کی زبان عبرانی سیکھیں (ترمذی) اسی حدیث کی بنیاد پر ہمارے اکابر نے کسی زبان کو سیکھنے سے منع نہیں کیا، بلکہ انگریزی کے حق میں تو انہوں نے فتوے تک دیئے ہیں کیونکہ یہ پہلے بھی رابطے کی اہم زبان تھی اور آج بھی اس کی بہت اہمیت ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے کسی سائل کے جواب میں یہ فتوی دیا تھا کہ ''انگریزی لکھنے پڑھنے اور ان کی اصطلاحات اور زبانیں سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے''۔(ضمیمہ فتاوی شاہ عبدالعزیز صفحہ ۱۹۵)

اسی طرح ایک فتوی حضرت مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کا بھی ہے کہ ''فی الواقع نفس تعلیم انگریزی شرعاً ممنوع نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو زبان یہود سیکھنے کا حکم کیا تھا، جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ میں مروی ہے، ملاعلی قاری کی شرح مشکوۃ میں ہے کہ شریعت میں کسی زبان کے سیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہو ایسی کوئی بات دلیل سے معلوم نہیں ہوتی خواہ لغت سریانی ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا ترکی یا فارسی ہو''۔(مجموعہ فتاوی عبدالحئ جلد ارصفحہ ۸۰)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے سوانح نگار حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ ''حضرت امام ربانی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق وفلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیوی نفع کی امید تو ہے'' اگر چہ انگریزوں سے نفرت کی بنا پر ہمارے نصاب تعلیم میں انگریزی زبان شامل نہیں کی گئی؛ لیکن اسے سیکھنے سے منع بھی نہیں کیا گیا۔

بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو انگریزی نہ سیکھنے کا اس وقت ملال ہوا جب آخری سفر حج میں ایک انگریز سے ان کی ملاقات ہوئی اور انگریز سے بات چیت کے لیے ترجمان کا سہارا لینا پڑا، حضرت نانوتویؒ کے خیالات وافکار سے وہ انگریز حد درجہ متأثر ہوا، قریب تھا کہ وہ اسلام لے آتا، مگر شاید اسلام اس کے مقدر میں نہیں تھا یا شاید ترجمانی میں کچھ کمی رہ گئی تھی، بہرحال اس واقعہ کا حضرت نانوتویؒ پر اس قدر اثر پڑا کہ آپ نے حجاز ہی میں یہ عزم کرلیا کہ میں واپس ہونے کے بعد انگریزی زبان خود سیکھوں گا۔(سوانح قاسمی)

انگریزی زبان سیکھنے کے سلسلے میں ہمارے مدارس نے جو کوتاہی کی ہے اس کے اثرات اب محسوس کئے جانے لگے ہیں، مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی نے اپنے بیٹے جسٹس محمد تقی عثمانی کی تصنیف ''علوم القرآن'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اصل میں یہ کتاب مجھے لکھنی تھی مگر میں نے دو وجہوں سے یہ کام اپنے بیٹے کے سپرد کیا، ایک تو یہ کہ میں مختلف امراض میں مبتلا ہوں اور روز افزوں ضعف بھی بڑھ رہا ہے، دوسری وجہ جو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ میں انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بنا پر مستشرقین یورپ کی ان کتابوں سے بالکل ہی ناواقف تھا، جن میں انہوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زہر آلود تلبیسات سے کام لیا ہے، برخوردار عزیز نے چونکہ انگریزی میں ایم اے، ایل ایل بی اعلی نمبروں میں پاس کیا انہوں نے ان تلبیسات کی حقیقت کھول کر وقت کی اہم ضرورت پوری کردی''۔ (علوم القرآن صفحہ ۱۵)

ایک طرف مدارس کا یہ اصرار کہ وہ انگریزی نہیں پڑھائیں گے، دوسری طرف انگریزی سیکھنے میں طلبہ کی دلچسپی کا یہ حال ہے کہ دیوبند میں بے شمار ادارے انگریزی اور کمپیوٹر سکھلانے کے کھل گئے ہیں اور ان کے ذریعہ سینکڑوں طلبہ اپنا خارجی وقت اور پیسہ خرچ کر کے یہ شوق پورا کر رہے ہیں، کیا حرج ہے اگر مدرسوں ہی میں اس تعلیم کا نظم ہوجائے، اگر چہ بعض بڑے مدرسوں نے اپنے فارغ طلبہ کے لیے انگریزی اور کمپیوٹر کی تعلیم کے شعبے کھول دیئے ہیں اور ان شعبوں میں دس بیس طلبہ داخل بھی ہیں، مگر اس میں عمومیت لانے سے کیا چیز مانع ہے یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔

لسانیات سے ہٹ کر بھی کچھ نئے علوم پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند نے کسی حد تک پیش رفت بھی کی ہے، تاریخ وسیر، جغرافیہ اور علم مدنیت کے نام پر کچھ کتابیں مطالعہ میں ضرور رکھی گئی ہیں، مگر وہ مطالعے میں ہونے کے باعث پوری طرح مفید ثابت نہیں ہورہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ وسیع مشاورت کے بعد کچھ جدید علوم کا اضافہ کیا جائے اور تدریس کے نئے اصولوں کے مطابق ان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

بات نئے علوم کی آئی ہے تو ہم پھر حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کے مقالے کی طرف لوٹتے ہیں، موصوف نے لکھا ہے کہ مروجہ نصاب تعلیم میں علوم قرآن، علوم حدیث، تاریخ اسلامی، سیرت نبویہ، ادب اور علوم بلاغت کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو بقیہ علوم وفنون کو حاصل ہے، جب کہ نصاب تعلیم میں اولیت واہمیت کا درجہ ان علوم کو حاصل ہونا چاہئے بقیہ علوم کو ثانوی درجہ میں رکھنا چاہئے، عربی زبان میں گفتگو، خطابت اور انشاء کو بھی کبھی اہمیت نہیں دی گئی لیکن اب وقت کا بھی تقاضہ ہے کہ ان کو نصاب میں پہلا درجہ دیا جائے، قدیم علوم کی بہت سی کتابوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور بجائے متأخرین کے قدماء کی مصنفات میں بہترین بدل موجود ہے، قدیم منطق، فلسفہ، کلام اور ہیئت میں بہت سرسری معلومات بھی کفایت کرسکیں گی، تنقیح کے ساتھ قواعد ومصطلحات کا علم کافی ہوگا اور ان کی جگہ تکمیل کے لیے جدید علم کلام، جدید علم ہیئت ریاضی اور اقتصادیات کو دینی چاہئے۔

اقتصادیات کی بات آئی تو یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ علم الاقتصاد باضابطہ ایک فن ہے اور موجودہ دور میں یہ فن بڑی اہمیت اختیار کیا گیا ہے اگر چہ حدیث اور فقہ کی کتابیں اسلامی نظام معیشت سے تعلق رکھنے والے مسائل سے بھری پڑی ہیں اور ہر کتاب میں بیع وشراء اور دوسرے مالی عقود ومعاملات سے متعلق ابواب شامل ہیں، لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تغیر پذیر حالات میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں انہیں بھی نصاب کا ایک حصہ بنا لیا جائے، اصول وقواعد پرانے ہیں، بس نئے مسائل کو ان پر منطبق کرنے اور نئی اصطلاحات کی روشنی میں ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۲۶/۲۵ راپریل ۲۰۰۹ء کو نئی دہلی کے جامعہ ہمدرد میں فقہ اکیڈمی اور دوسرے اداروں کے اشتراک سے ایک قومی ورکشاپ منعقد کیا گیا، اس کا موضوع تھا ''ہندوستانی مدارس میں اسلامی مالیات،

معاشیات کی تعلیم'' اس قومی ورکشاپ میں مدارس عربیہ اور عصری جامعات کے اساتذہ پروفیسر حضرات کے ساتھ بہت سے نوجوان فضلائے مدارس نے بھی شرکت کی، ان سب نے اپنی تقریروں میں ایک ہی بات کہی کہ مدارس کے نصاب میں اسلام کے نظام اقتصاد کو ایک مضمون کی حیثیت سے شامل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس وقت ساری دنیا سودی نظام سے متنفر نظر آ رہی ہے، کساد بازاری کے اس بحران نے جس میں مغرب سے مشرق تک تمام ممالک مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے ہزاروں کمپنیاں، بینک اور صنعتی اکائیاں بند ہوگئی ہیں اور لاکھوں لوگ بے روزگار ہوگئے ہیں، دنیا بھر کے لوگوں کو ایک ایسا راستہ ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا ہے جو اس بحران سے نکلنے میں ان کی مدد کر سکے، اس تلاش نے ان کی رہ نمائی اسلامی نظام معیشت کی طرف کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی نظام پریشان حال انسانیت کا غم گسار ہوسکتا ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام اور موجودہ سرمایہ کاری نظام دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اسلام میں قمار اور سود کی سخت ممانعت ہے جب کہ یہ دونوں چیزیں سرمایہ کاری نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، اب دنیا موجودہ نظام کی کوتاہیوں کو اچھی طرح سمجھ گئی ہے اور سود وقمار اور محرمات سے پاک سرمایہ کاری کی طرف متوجہ ہورہی ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے ۷۵ر ممالک میں ۴۰۰ر سو سے زیادہ اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے قائم ہو چکے ہیں، ایک اندازے کے مطابق ان بینکوں اور مالیاتی اداروں میں ۷۰۰ر ملین ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا ہے، اس میں ہر سال ۱۰ر سے ۱۵ر فیصد تک اضافہ درج کیا جا رہا ہے، اور کاروباری امور کے ماہرین یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ یہ سرمایہ ۲۰۱۰ء تک ایک کھرب چار ارب ڈالر تک پہنچ جائے گا، اسلام نظام معیشت کی طرف دنیا کی اس تیز رفتار توجہ نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آخر ان کی رہنمائی کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صرف علمائے دین ہی موجودہ سرمایہ کاری کو اسلامی نظریات کے مطابق فروغ دینے میں اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں، کیونکہ اسلام کے مالی عقود ومعاملات پر یہی لوگ نظر رکھتے ہیں اور یہی لوگ اسلامی اصولوں کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے علماء اسلامی نظام معیشت سے تو اچھی طرح واقف ہیں مگر معیشت کے موجودہ عالمی سسٹم سے واقف نہیں ہیں، مثال کے طور پر زیادہ تر علماء بینک، اسٹاک، ایکسچینج اور انشورنش کمپنیوں کے نظام سے واقفیت نہیں رکھتے، حالانکہ اس وقت یہی تینوں ادارے موجودہ مالیاتی نظام میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں، سرمائے کی حفاظت، سرمائے کی فراہمی، سرمائے کی واپسی یہ سب امور ان ہی تین اداروں سے متعلق ہیں، کیونکہ ہمارے علماء کو ان اداروں کے نظام کا صحیح طور پر علم نہیں ہے اس لیے وہ بعض معاملات میں جواز یا عدم جواز کا کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے، یوں بھی جب تک کسی سسٹم پر پوری نظر نہ ہو اس وقت تک کوئی بھی شخص کیا رائے قائم کر سکتا ہے۔

پاکستان کے ممتاز عالم دین جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی کیونکہ وہ جدید وقدیم علوم کے ماہر ہیں اس لیے انہوں نے اس ضمن میں مثبت پہل کی ہے، اس سلسلہ میں ان کی متعدد کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں، بہت سے اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے مولانا کی خدمات سے مستفیض ہو رہے ہیں، آنے والے سالوں میں ہمیں مولانا محمد تقی عثمانی جیسے علمائے دین کی سخت ضرورت ہوگی، اگر مدارس نے ادھر توجہ نہ دی تو اس خلا کو دوسرے لوگ پورا کرنے کی کوشش کریں گے، اس طرح موجودہ مالیاتی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کا مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا اور اس کی تمام تر ذمہ داری علمائے دین کی ہوگی۔ (بشکریہ ''ترجمان دیوبند'' جون ۲۰۰۹ء)

محاسن اسلام

اسلام میں انسانی حقوق کی اہمیت

مولانا اسرارالحق قاسمی صدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن، نئی دہلی

اسلام میں انسانیت کو عظیم مقام عطا کیا گیا ہے، دیگر تمام مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیئے جانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تمام مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو زیادہ اہمیت وعظمت حاصل ہے، خالق نے اپنا خلیفہ بھی انسان ہی کو بنایا ہے اور قرآن مجید میں اس کا ذکر دلائل کے ساتھ تفصیل سے کیا گیا ہے، اتنے عظیم مقام پر انسان کا فائز کیا جانا اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان اپنے منصب اور وقار کے ساتھ زندگی گزارے اور ایسے کام نہ کرے جس سے اس کا مقام مجروح ہوتا ہو، اتنے اعلیٰ مقام پر فائز کرنے کے بعد انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اسے یہ احساس دلا دیا گیا کہ خالق کے یہاں اس کی بڑی اہمیت ہے، اب جو شخص بھی اپنے آپ کو پہچانے گا وہ یقیناً اپنی زندگی کو اچھی طرح گزارے گا اور اپنے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی بسر کرے گا؛ لیکن جو شخص اپنے آپ کو نہیں پہچانے گا وہ یقینی طور سے اپنے اس مقام کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا، جو اسے قدرت کی جانب سے عطا کیا گیا ہے۔

خالق نے انسان کے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھی ہیں، اسے بہترین دماغ دیا ہے، اسے علم واحساس سے آراستہ کیا ہے، اسے بہترین اعمال انجام دینے کی صلاحیت بخشی ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں برے کام کرنے کی صلاحیت بھی رکھ دی، تاکہ وہ برے کاموں سے بچ کر اچھے کاموں کی طرف مائل ہو، جو شخص اپنے آپ کو برے کاموں سے بچا لیتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے، خالق اپنے ایسے بندے کو بہت پسند فرماتا ہے اور اس کو روز قیامت اجر عظیم سے نوازے گا۔

انسانیت کے مقام اور بہترین وپرسکون زندگی گزارنے کے لیے اسلام نے باہم انسانوں کے جذبات کی قدر کرنے کی تاکید کی ہے، ہر ایسے عمل سے منع کیا ہے جس سے انسانی جذبات مجروح ہوتے ہوں اور انسان کو تکلیف پہنچتی ہو، دین اسلام میں انسانیت کو کتنا بڑا مقام دیا گیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں پر تمام انسانوں کے حقوق متعین کئے ہیں، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق، یتیموں کے حقوق، غیر مسلموں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، مہمانوں کے حقوق، مسافروں کے حقوق کا تعین کیا ہے اور ان کو پورا کرنے کی تاکید کی ہے، اولاد کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا گیا: " ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق نحن نرزقهم وإياكم ان قتلهم خطأً كبيرا" اور اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی، حقیقت یہ ہے کہ نسل کشی بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ (بنی اسرائیل ۳۱)

اس آیت سے معلوم ہوتا کہ نسل کشی گناہ عظیم ہے اور اولاد کے قتل کی تمام شکلیں ناجائز ہیں، موجودہ دور میں بھلے ہی والدین کے ہاتھوں اپنے بچوں کے قتل کے واقعات کی شرح فیصد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو مگر اولاد کو پیدا نہ ہونے دینے کے لیے دنیا بھر میں بڑی کوششیں چل رہی ہیں، وضع حمل کے لیے مختلف قسم کی دوائیوں اور مختلف تدبیروں کا استعمال کیا جا رہا ہے، اولاد اور گھر والوں کی زندگی کو بہتر بنانے اور کامیاب کرنے کے لیے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: " يا أيها الذين آمنوا قوا انفسكم وأهليكم نارا" اے ایمان والو اپنے آپ کو اور

اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔(تحریم ۶) یعنی والدین اپنی اولاد کو ایسی تعلیم وتربیت دیں جو انہیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھ سکے، اس کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کیا جائے، کیونکہ اس کا مقصد ہی انسان کو سیدھا راستہ دکھانا، اللہ کی وحدانیت پر لوگوں کے یقین کو پختہ بنانا اور اس بات کو واضح کرنا ہے کہ ہر چیز فنا ہوجانے والی ہے، محض اللہ کی ذات باقی رہنے والی ہے، اس نے ساری دنیا کو پیدا کیا ہے، وہی رازق و مالک ہے، اس کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا، چنانچہ وہی عبادت کے لائق ہے، اس کے احکام کی پیروی لازمی ہے اور اس کے مبعوث کیے ہوئے دین پر چلنے میں ہی فلاحیابی ہے، اور ہر انسان کو بالآخر اس کی طرف لوٹنا ہے، اچھی تعلیم وتربیت کے ساتھ والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے اولاد کے لیے بھی دعا کریں، ارشاد باری ہے "وأصلح لي في ذريتي" اور میری اولاد میں صلاح وتقوی دے۔(سورۂ احقاف ۱۵)

تقوی انتہائی اہم چیز ہے جس سے اللہ کا تقرب حاصل ہوتا ہے، اس سے انسان کی افضلیت بڑھتی ہے، ارشاد باری ہے:"ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم" بلاشبہ تم میں زیادہ مکرم اللہ کے نزدیک وہ ہے جو متقی ہے، حیرت کی بات ہے کہ بہت سے لوگ اپنے اولاد سے بے انتہا محبت کرتے ہیں، ان کے لیے اعلی سہولیات مہیا کرتے ہیں، ان کے لیے گاڑیاں خریدتے ہیں، زمینیں خریدتے ہیں اور کشادہ مکانات بناتے ہیں، تاکہ اولاد پریشان نہ ہوں اور وہ آرام کی زندگی بسر کریں، مگر ان کی تعلیم کا بہترین بندوبست نہیں کرتے یا ایسی تعلیم دلانے میں عار محسوس کرتے ہیں جو ان کی دنیا وآخرت دونوں جہاں کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

اسلام نے خواتین کے بھی بہت سے حقوق بیان کئے ہیں تاکہ خواتین کو ان کا مقام ملے، ان کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور انہیں سماج میں گری ہوئی نگاہوں سے نہ دیکھا جائے، مثلاً اسلام نے تہمت والزام تراشی کو اسی لیے ناپسندیدہ قرار دیا ہے کہ اس سے انسان کی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور سماج میں اس کے لیے جینا دوبھر ہوجاتا ہے، اگر ایک بار کسی عورت کی بدنامی ہوجاتی ہے تو زندگی بھر اسے پریشانیوں ومصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:"ان الذين يرمون المحصنات الغافلات المؤمنات لعنوا في الدنيا والآخرة ولهم عذاب عظيم يوم تشهد عليهم ألسنتهم وأيديهم وأرجلهم بما كانوا يعملون" جو لوگ پاک دامن بھولی بھالی بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا وآخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا زبردست عذاب ہے، جس دن ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔(النور ۲۳/۲۴)

اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے اس پر جھوٹی تہمت لگانا، اس کے مقام کے خلاف کام کرنا ہے، عورت کی تذلیل کرنے کے لیے الزام تراشی پر روز قیامت سخت پکڑ ہوگی، اسلام میں بدگمانی سے بھی روکا گیا ہے، کیونکہ بعض مرتبہ یہ بدگمانی اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے، اس کے مشاہدات ہم آئے دن سماج میں کرتے رہتے ہیں، اگر میاں بیوی کے درمیان شکوک وشبہات یا بدگمانیاں ہوتی ہیں، تو ان کی ازدواجی زندگی تلخ ہوجاتی ہے اور نوبت کافی آگے تک پہنچ جاتی ہے، اسی طرح کی بدگمانیاں کبھی شوہر کی طرف ہوتی ہیں اور کبھی بیوی کی طرف سے، بنا تحقیق وثبوت دوسرے کے بارے میں بدگمانی کرنا، اس کی حق تلفی ہے، تکبر کرنے اور حقیر سمجھنے سے بھی اسلام میں روکا گیا ہے، کیونکہ معاشرہ میں اس کے خطرناک نتائج ظاہر ہوتے ہیں، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے کہ:"ولا تصعر خدك للناس"(غرور میں) لوگوں سے گال نہ پھلاؤ۔(سورہ لقمان ۱۸)

کسی پر عیب لگانا اور طرح طرح کے نام بھی باعث تکلیف عمل ہے اور انسانی حقوق کے خلاف ہے، اس لیے اسلام نے ایسا کرنے سے بھی منع کیا ہے، اگر وہ عیب اس کے اندر موجود ہو تب بھی اس کو اس عیب کے ساتھ پکارنا نامناسب عمل ہے، کیونکہ چاہے وہ بات بھلے ہی صحیح ہو، مگر اس سے اس شخص کو تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً کوئی آنکھوں سے نابینا ہے، اسے اندھا کہنا، اسے اور زیادہ تکلیف میں مبتلا کرنا ہے، ایسے

ہی اگر کسی کے پاؤں نہیں ہیں، اسے لنگڑا کہہ کر پکارنا بھی غلط ہے، کیونکہ یہ بات بھی باعث تکلیف ہے اور اگر کسی میں عیب نہ ہو، پھر اس پر عیب لگانا بہتان تراشی ہے، جو بالکل ناجائز ہے، چنانچہ اس طرح کی باتوں سے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو سختی سے روکا ہے، اللہ کا ارشاد ہے:"یاأیھا الذین آمنوا لایسخرقوم من قوم عسی ان یکونوا خیراً منھم" اے مومنو! ایک لوگ دوسرے لوگوں کا مذاق نہ اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔(سورہ حجرات ۱۱)

انسانی حقوق کی جس طرح بھی پامالی ہو، اسلام کے خلاف ہے، قیامت کے دن اس کی سخت باز پرس ہوگی، بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتی ہیں، مگر وہ بھی حق تلفی ودل آزاری کا سبب بنتی ہیں، جیسے کسی کی ٹوہ میں لگ جانا، ارشاد باری ہے:"ولاتجسسوا ولایغتب بعضکم بعضاً" اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگے رہو اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو (الحجرات ۱۲) ایک اور جگہ مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا:"ولاتقف مالیس لك به علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئك کان عنه مسؤلا" اور کسی ایسی بات کے پیچھے نہ لگ جاؤ جس کا تمہیں پورا علم نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ کان، آنکھ اور قلب سبھی کی باز پرس ہونی ہے (بنی اسرائیل ۳۶) کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا شریعت کی نگاہ میں انتہائی قبیح عمل ہے، اور اس پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، اللہ کا ارشاد ہے:"ولایغتب بعضکم بعضاً أیحب احدکم ان یاکل لحم أخیه میتا فکرھتموہ" اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تم ضرور نفرت کروگے۔(سورہ حجرات ۱۲)

بیوہ عورتوں کو بھی اسلام میں بڑی عزت دی گئی ہے، اور ان کے حقوق متعین کئے گئے ہیں، کیونکہ وہ عورتیں جن کے شوہر انتقال کر چکے ہوں اور بے کسی کی زندگی گزار رہی ہوں، معاشرہ میں سب سے زیادہ رحم وسلوک کی مستحق ہیں، اسلام نے ان کو عزت بخشی ہے اور ان کے ساتھ کسی بھی طرح کی ناروا سلوک کو ممنوع قرار دیا ہے، اللہ تعالی نے فرمایا:"یاأیھا الذین آمنوا لایحل لکم ان ترثوا النساء کرھا" اے ایمان والو! حلال نہیں تم کو کہ میراث میں لے لو عورتوں کو زبردستی (نساء ۱۹) یعنی جب شوہر کا انتقال ہوجائے تو شوہر کے خاندان والے اس کو اپنی میراث نہ سمجھیں، وہ آزاد ہے، اگر وہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنا اختیار چلا کر اسے نکاح سے روکے، فرمایا گیا:"ولاتعضلوھن لتذھبوا ببعض ماآتیتموھن" اور نہ روکے رکھو ان کو اس واسطے کہ لے لو ان سے کچھ اپنا دیا ہوا، کیونکہ عورت شوہر کے بعد اور زیادہ رحم وسلوک کی مستحق ہوجاتی ہے، اس لیے یہ قطعاً جائز نہیں کہ شوہر نے اپنی حیات میں اسے جو مال اور مہر دیا ہے وہ اس سے چھین لیا جائے، قرآن نے بیوہ عورتوں کے لیے انتہائی اہم بات بیان کی، ارشاد باری ہے:"وأنکحوا الأیامی منکم" اور تم میں جو عورتیں بیوہ ہوں، ان کے نکاح کردو۔(سورۂ نور ۳۲)

اسلام نے غیر مسلموں کے بھی حقوق متعین کئے ہیں اور بحیثیت انسانیت کو ان کو عزت دی ہے، ارشاد باری ہے "ولقد کرمنا بنی آدم" اور ہم نے اولاد آدم کو عزت والا بنایا، ایک اور موقع پر قرآن مجید میں اس کی اہمیت کی بابت فرمایا گیا:"یاأیھا الناس انا خلقناکم من ذکر وأنثی وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا إن اکرمکم عنداللّٰه اتقاکم" اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، پھر تمہاری قومیں اور برادریاں کیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو! درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (الحجرات ۱۳) اس آیت میں دو باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ تمام انسان اپنی پیدائش کے لحاظ سے برابر ہیں، ان میں اونچ نیچ، چھوٹے بڑے، کالے گورے، امیر غریب اور بادشاہ وفقیر کا کوئی فرق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ انسان کی عظمت واہمیت تقوی پر مبنی ہے، یعنی اللہ کے نزدیک انسان کی افضلیت کا معیار تقوی ہے، جو شخص جتنا متقی و پرہیزگار ہوگا، اللہ اس اتنا ہی پسند فرمائے گا اور بہتر اجر سے نوازے گا۔ ❁

دوسری قسط

قرآن کریم کا اعجاز

اوراس کے فنی محاسن

مولانا مفتی رحمت اللہ ندوی نیپالی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الفاظ کا اعجاز:

کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ وہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ہی بلند مرتبہ پر ہو، یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ بسااوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر مجبور ہوجاتا ہے لیکن پورے قرآن کریم میں ''الحمد'' سے لے کر ''والناس'' تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت وبلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں۔

ترکیب کا اعجاز:

الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا نمبر آتا ہے اس معاملہ میں قرآن کریم کا اعجاز اوج کمال پر ہے، قرآن کریم کے جملوں کے دروبست میں وہ شوکت، سلاست اور شیرینی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لیے عربی میں کئی مقولے مشہور تھے مثلاً: ''القتل إحياء للجميع، القتل أنفى للقتل، أكثروا القتل ليقل القتل'' وغیرہ، یہ جملے بہت مقبول اور زبان زد تھے اور فصیح سمجھے جاتے تھے؛ لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو اس شان سے ادا کیا ''ولكم في القصاص حياة'' اس جملہ کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھیے بلاغت کا معجزہ شاہکار معلوم ہوتا ہے اور پہلو کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔

اسلوب کا اعجاز:

قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ ہر کس وناکس کرسکتا ہے، اس کے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات میں سے یہ ہیں:

(۱) نثر پر مشتمل ہونے اور شعری قواعد وضوابط کے ملحوظ نہ ہونے کے باوجود لذیذ اور شیریں آہنگ اور شعر سے کہیں زیادہ حلاوت ولطافت کا وجود۔

(۲) علمائے بلاغت کے وضع کردہ اسالیب ثلاثہ (خطابی، ادبی، علمی) جن کا دائرہ الگ، خصوصیات جدا اور مواقع مختلف ہیں، ایک ہی عبادت میں ان تینوں کو جمع کردینا قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ وہ خطابت کا زور، ادب کی شگفتگی اور علم کی متانت، تینوں ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی۔

(۳) قرآن کریم کے مخاطب دیہاتی، پڑھے لکھے لوگ، اعلی درجے کے علماء اور ماہرین فنون سب ہیں، ایک ہی اسلوب بیک وقت ان تینوں طبقوں کو متأثر کرتا ہے اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ قرآن کریم میرے ہی لیے اترا ہے'' وأنزلنا إليكم كتاباً فيه ذكركم الخ''۔

چنانچہ ایک عام آدمی کے ذہن کے پیش نظر قرآن کریم کا طریق استدلال بہت سادہ اور زیادہ تر مشاہدہ کی دلیلوں پر مبنی ہے، توحید، رسالت، آخرت، آفرینش حیات اور وجود باری جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس نے بالکل سامنے کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے۔

(۴) تکرار کلام کے باوجود نہ تو کلام کا زور ٹوٹتا ہے نہ تاثیر کم ہوتی ہے، نہ سننے والا اکتاتا ہے؛ بلکہ ہر مرتبہ نیا کیف، نئی لذت اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے۔

(۵) کلام کی شوکت اور اس کی نزاکت وشیرینی دو متضاد صفتیں ہیں، دونوں صفتوں کو ایک ہی عبادت میں جمع کر دینا صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے اور انسانی قدرت سے باہر ہے کیونکہ دونوں کے لیے الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے۔

(۶) بعض خشک اور سنگلاخ موضوع ومضامین کو بلاغت کے اوج کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے جو کسی بشری ذہن سے ہزار کوششوں کے باوجود ناممکن ہے جیسے قانون وراثت، مثال کے طور پر "یوصیکم الله في اولادکم الخ" والے رکوع کی تلاوت کیجئے، اس کے حسن وجمال کے ساتھ ایک ایک جملہ پر ذوق سلیم وجد کرے گا۔

(۷) قرآن کریم میں اس قدر مختلف الانواع مضامین بیان کئے گئے ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے، ترغیب وترہیب، وعدوعید، وعظ و نصیحت، امثال وقصص اور عقائد واحکام وغیرہ ہر جگہ اس کا بیان بلاغت کے اعلی ترین معیار کو پہنچا ہوا ہے، جب کہ ہر شاعر یا ادیب کی فصاحت وبلاغت کا ایک مخصوص میدان ہوتا ہے، جس سے ہٹ کر اس کا کلام پھیکا پڑ جاتا ہے۔

(۸) اختصار وایجاز قرآن کریم کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے اور اس وصف میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے، چونکہ وہ قیامت تک ہر زمانہ کی رہنمائی کے لیے آیا ہے، اس لیے اس نے مختصر جملوں میں وہ وسیع مضامین سمیٹ دیئے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں اس سے ہدایات حاصل کی جاسکتی ہے۔

۴-نظم کا اعجاز:

قرآن کریم کا ایک دقیق اعجاز آیات کے باہمی ربط وتعلق اور نظم وترتیب میں ہے، اگرچہ ہمارے مفسرین کے نظم قرآن کے بارے میں دو گروہ ہوگئے ہیں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ ۲۳؍سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا، لہٰذا کوئی ربط وترتیب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ہر آیت ایک مستقل مضمون کی حامل ہے، اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے اور شروع سے آخر تک باہم مربوط ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات کے درمیان نہایت لطیف ربط پایا جاتا ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ورنہ اگر کوئی ترتیب ملحوظ نہ ہوتی تو ترتیب نزول اور ترتیب کتابت میں فرق رکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جس ترتیب سے قرآن کریم نازل ہوا تھا اسی ترتیب سے لکھ لیا جاتا۔

نظم قرآن کریم کی ایک ہلکی سی جھلک اس مثال میں دیکھی جاسکتی ہے، سورہ حجر میں ایک جگہ ارشاد ہے: "نبئ عبادي أني أنا الغفور الرحيم وأن عذابي هو العذاب الأليم" اس کے فوراً بعد ارشاد ہے: "ونبئهم عن ضيف إبراهيم" اور اس کے بعد فرشتوں کے حضرت ابراہیم کے پاس آنے کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے، بظاہر دونوں باتوں میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا؛ لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پہلے جملے کی تائید ہے، اس لیے کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے انہوں نے دو کام کئے ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام جیسے صالح بیٹے کی خوشخبری دی، دوسرے انہی فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستی پر جاکر عذاب نازل کیا، پہلا کام "أنا الغفور الرحيم" کا مظاہرہ تھا اور دوسرا کام "عذابي هو العذاب الأليم" کا، اس طرح یہ دونوں جملے باہم نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں؛ لیکن الگ الگ دیکھئے تو ان کی مستقل حیثیت بھی ہے۔ (ملخص از علوم القرآن صفحہ ۲۵۴؍تا ۲۶۸)

۵-صوتی اعجاز:

مذکورہ بالا چار عنوانات میں صوتی اعجاز کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، قرآن کریم کی ہر آیت وسورت، ہر مقطع ومطلع اور ہر آغاز وانجام میں ایک خاص قسم کا صوتی حسن وجمال پایا جاتا ہے، اگر بقول سید قطب شہیدؒ یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کی سحر بیانی کا راز اس کے نظم ونسق میں

مضمر ہے تو یہ بات بعید از قیاس نہ ہوگی، یہ نظم وترتیب، شعرونثر کے اوصاف وخصائص کی جامع ہے۔

اگرچہ قرآن کریم اوزان وقوافی کے حدود وقیود سے پاک ہونے کی بنا پر تعبیر وبیان کی آزادی کی صفات سے بہرہ ور ہے مگر اس کے دوش بدوش اس میں شعر کی باطنی موسیقی اور ایسے ہم وزن فواصل پائے جاتے ہیں جو شعری اوزان وقوافی سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے علوم القرآن صفحہ ۴۶۶)

مصطفیٰ صادق رافعی نے قرآن کریم کے صوتی نظم وربط کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ہے، فرماتے ہیں:

''قرآن کریم عدیم المثال صوتی ہم آہنگی کا حامل ہے، اور اس ضمن میں کوئی کتاب اس کی حریف نہیں بن سکتی، اصوات ومخارج کے اعتبار سے اس کے حروف میں ایک خاص قسم کی یگانگت پائی جاتی ہے، یہ حروف ''ہمس، جہر، شدت ورخوت، تفخیم وترقیق اور تکرار میں باہم بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں''۔

رافعی صاحب مزید فرماتے ہیں:

''قرآن کریم سب کا سب زور کلام اور ندرت بیان میں اپنی مثال آپ ہے، اس کی بڑی وجہ قرآن کریم کی روح ترکیب ہے جس پر کلام الٰہی کا مدار وانحصار ہے، قرآن کے سوا یہ روح عربی زبان میں اور کہیں نہیں پائی جاتی، اسی روح کے بل بوتے پر قرآن کریم بشری استطاعت کی حدود سے خارج ہے، اگر اس میں وہ روح نہ ہوتی تو اس کے اجزاء میں تفاوت وتباین نظر آنے لگتا، اسی روح نے اس کے اجزاء کو باہم مربوط ومتصل بنا دیا ہے''۔ (علوم القرآن للدکتور صبحی الصالح صفحہ ۴۵۲/۴۵۴)

بلاشبہ قرآن میں ہزاروں معجزات ہیں جو زندہ جاوید ہیں، تا قیام قیامت باقی رہنے والے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ختم نہیں ہوئے۔

مؤلف ''مناہل العرفان'' لکھتے ہیں:

''فمعجزات محمدفي القرآن وحده آلاف مؤلفة وهي متمتعة بالبقاء إلى اليوم وإلى مابعد اليوم حتى يرث الله الأرض ومن عليها''۔

''أما معجزات سائرالرسل فمحدودة العدد، قصيرة العدد، ذهبت بذهاب زمانهم، وماتت بموتهم ومن يطلبها الآن، لايجدها إلا في خبركان ولا يسلم له شاهد بها إلاهذا القرآن وتلك نعمة يمنها القرآن على سائر الكتب والرسل وماصح من الأديان''۔ (مناهل العرفان جلد ۲/ ۳۳۶)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تنہا ہزار ہا ہزار معجزات قرآن میں ہیں، جو آج تک اور آج کے بعد قیامت تک باقی رہیں گے، تمام رسولوں کے معجزات تعداد میں کم اور محدود تھے، جو ان کا دور ختم ہوتے ہی ختم ہوگئے اور ان کی وفات سے فوت ہوگئے، اب انہیں جو تلاش کرے گا ماضی کی خبر کے سوا کہیں نہ پائے گا اور نہ قرآن کے علاوہ ان کا کوئی گواہ ملے گا اور یہ ایسی نعمت ہے جس کا احسان قرآن تمام کتابوں اور رسولوں اور صحیح ادیان پر جتاتا ہے۔

الغرض قرآن اختصار وجامعیت کا نادر نمونہ ہے، مختصر الفاظ میں معانی کثیرہ کو اس طرح جمع کیا کہ اسے دریا بکوزہ کا مصداق قرار دیا جاسکتا ہے، مثلاً اہل جنت کی شراب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''لايصدعون عنها ولاينزفون'' ان دونوں کلمات میں دنیوی شراب کے تمام عیوب کو جمع کردیا ہے، اہل جنت کے میوہ جات کے تذکرہ میں فرمایا: ''لامقطوعة ولاممنوعة'' ان دونوں الفاظ میں میوہ جات کے جملہ محاسن کو یکجا کردیا ہے۔

ڈاکٹر صبحی صالح اپنی کتاب ''علوم القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے فصحائے عرب کو دعوت مقابلہ دی تھی، اسی چیلنج کو دئے ہوئے ایک عرصہ دراز گزر گیا، مگر کسی کو اس کے قبول کرنے کی جرأت نہ ہوئی؛ بلکہ کفار نے اپنے عجز وتقصیر کا اعتراف کرلیا، اس لیے کہ قرآن غالب ہے مغلوب نہیں اور وہ کسی بشر کا کلام بھی نہیں''۔ (علوم القرآن صفحہ ۴۴۸)

❁ ❁ ❁

یادرفتگاں

مولانا عبدالحمید صاحب قاسمیؒ

کچھ یادیں کچھ باتیں

ڈاکٹر عمران احمد عندلیبؔ، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ، نئی دہلی

اللہ رب العزت اپنی مقدس کتاب قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے :"کل نفس ذائقة الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامة فمن زحزح عن النار وأدخل الجنة فقد فاز وماالحیاة الدنیا إلا متاع الغرور"۔(سورہ آل عمران ۱۸۵)

''ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پوری پاداش تمہاری قیامت کے ہی روز ملے گی، تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں، صرف دھوکے کا سودا ہے''۔

مندرجہ بالا مقدس کلام کی روشنی میں اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان کو موت نہیں آ سکتی، یہاں ایک اٹل حقیقت کا بیان ہے کہ موت سے کسی کو مفر نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اس دار فانی میں جس نے جو اعمال کئے، اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، تیسرا اہم نکتہ یہ کہ جس نے اپنے رب کو راضی کرلیا وہی کامیاب شخص ہے، چوتھی اہم بات یہ ہے کہ دنیا کی زندگی عوام الناس کے لیے فریب ہے، اس فریب سے جو بچ گیا وہ خوش نصیب ہے اور جو پھنس گیا وہ ناکام و نامراد، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:عن انس رضی اللّٰه عنه قال: خط النبی صلی اللّٰه علیه وسلم خطوطاً، فقال:"هذا الإنسان وهذا أجله فبینما هو کذلك إذا جاء الخط الأقرب"۔(رواہ البخاری)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی لکیریں کھینچیں پھر (ایک خط کی طرف اشارہ کرکے) فرمایا کہ یہ انسان ہے (یعنی اس کی آرزوئیں) اور (دوسرے خط کی طرف اشارہ کرکے فرمایا) یہ اس کی موت ہے، پس انسان اسی طرح آرزؤں کے درمیان ہوتا ہے کہ سب سے قریب لکیر (موت) آ پہنچتی ہے''۔

اگر ہم اس مذکورہ بالا حدیث پر غور کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ انسان کی زندگی حادثوں کا نام ہے، ایک حادثے سے بچتا ہے تو دوسرا اسے گھیر لیتا ہے، پوری زندگی امید و بیم کے گیسو سنوارنے میں گزر جاتی ہے، یہاں تک کہ موت کا آہنی پنجہ اسے اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے اور انسان کا یہی وہ نقطۂ عروج ہے جہاں ساری آرزوئیں دم توڑ دیتی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جو خط انسان کے سب سے قریب ہے وہ اس کی موت ہے، اس کی غفلت انسان کے لیے سراسر خسارہ ہے، یہی وہ تلخ حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں؛ لیکن مولانا عبدالحمید قاسمی اس حقیقت سے آشنا تھے، وہ کبھی موت سے غافل نہیں رہے۔

مولانا عبدالحمید قاسمی نفوس قدسیہ میں سے تھے، جو اب ہمارے درمیان نہیں رہے، مجھے اس بات کا صحیح علم نہیں کہ ان سے میری پہلی ملاقات کب، کہاں اور کس حوالے سے ہوئی؟ لیکن جہاں تک یاد آتا ہے کہ جنوری کا مہینہ تھا اور مجھے ان دنوں علی گڑھ کا سفر درپیش تھا، اپنے گاؤں سے سمریاواں بازار (ضلع سنت کبیر نگر) پہنچا تو میری نظر ایک ایسی جگہ جا کر ٹھہر گئی جہاں میرے خاندان کے ایک عظیم فرد مولانا صابر علی قاسمی ساتھ میں مولانا عبدالحمید قاسمی اور مولانا مجیب بستوی ایک تخت پر جلوہ گر تھے، میں مولانا صابر صاحب سے ملاقات کی غرض سے

آ گے بڑھا تو انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے مولانا عبدالحمید صاحب سے صرف دو جملے کہے'' کہ یہ میرے گھر کا انتہائی ذہین لڑکا ہے اوراس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے''، مجیب بستوی سے میری ملاقات کچھ پرانی تھی اور وہ مجھے اچھی طرح سے پہچان رہے تھے؛ لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی عمران اور کبھی غفران (جو میرے بڑے بھائی ہیں) کہہ کر پکارتے، لہٰذا انہوں نے برجستہ کہا کہ غفران پھر واپسی کب ہوگی؟ میں جواب میں صرف یہ مصرعہ پڑھا'' پھر ملیں گے اگر خدا لایا'' اور مصافحہ کرکے بس کی طرف روانہ ہوگیا، یہ تھی ان سے میری پہلی ادھوری ملاقات جس کا نقش میرے دل ودماغ پر آج بھی برقرار ہے، اس ادھوری ملاقات کا فیضان یہ ہے کہ میں انہیں کبھی نہیں بھول سکا کیونکہ

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

اس کے بعد اکثر وبیشتر ان سے ملاقات کا سلسلہ چلتا رہا، ایک بار ایسا ہوا کہ مولانا ابرار قاسمی نے اپنے مدرسہ میں ایک چھوٹی سی نشست الجمعیۃ کے حوالے سے رکھی، جس کا موضوع تھا''مسلمانوں میں جہیز کی لعنت'' اوراس کی صدارت مولانا عبدالحمید صاحبؒ فرمارہے تھے، میں بھی کسی کام سے دو روز قبل مدرسے کے مہمان کی حیثیت سے وہاں موجود تھا، مسجد میں مذاکرہ رکھا گیا اور علاقے کے نامور علماء کرام اوراہل قلم حضرات وہاں موجود تھے، پروگرام شروع ہوا تو میرے پاس مولانا حسین احمد قاسمی تشریف لائے اور کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب آپ بھی چلئے، کچھ لوگ آپ کا انتظار کررہے ہیں، لہٰذا میں بھی اپنے کمرے سے نکل کر مسجد میں حاضر ہوا، جہاں ایک سے ایک علماء کرام کا خطاب ہورہا تھا، میں وہاں سامع کی حیثیت سے موجود تھا لیکن قربان جائیے مولانا حسین احمد قاسمی کی محبت پر کہ انہوں نے مجھے کچھ کہنے کے لیے اس محفل میں مجبور کردیا، میرے سامنے بڑی مشکل تھی کہ علاقے کے معتبر وبزرگ علماء کرام جلوہ فرما تھے اور دوسری مشکل یہ تھی کہ مولانا عبدالحمید صاحب قاسمی صدارت کے منصب جلیلہ پر فائز تھے، بہرحال میں اپنے چند تأثرات کولے کران کے درمیان حاضر ہوا، پروگرام ختم ہونے کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا گیا، نماز ظہر ادا کی گئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کے لیے روانہ ہوگئے۔

دوسرے دن میں اقرار حسین (پلن بھائی) کے ساتھ سمریاواں بازار کسی کام سے گیا ہوا تھا، جہاں میری ملاقات مولانا عبدالحمید قاسمی صاحب سے ہوئی، انہوں نے مجھے دیکھا اور فوراً ایک صاحب کو میری طرف دوڑایا کہ وہ صاحب جو وہاں کھڑے ہیں ان کو بلالاؤ، میں نے انہیں دیکھا اور فوراً تمام مصروفیات ترک کرتے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، آج مولانا نے مجھے سلام کرنے کا موقع نہیں دیا، بلکہ وہ مرحبا مرحبا کہتے ہوئے میری طرف بڑھے اور مصافحہ کرنے کے علاوہ انہوں نے اپنے سینے سے لگالیا، فوراً چائے کی دکان پر ایک بچے کو اشارہ کیا کہ دو چار کپ چائے لے آؤ، یہ میری ان سے ادھوری نہیں بلکہ پوری ملاقات تھی جہاں انہوں نے مجھے بہت ساری نصیحتیں کرتے ہوئے دعاؤں سے نوازا، اس پوری تمہید کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ جس کی طرف میں اشارہ کرنے جارہا ہوں جو مجھے آج بھی بےقرار رکھتی ہے، انہوں نے دوران گفتگو مجھ سے ایک بات بڑی اہم کہی''ہم سب جہیز کی لعنت پر ایک دوسرے کو برا کہتے ہیں لیکن جب موقع آزمائش کا ہوتا ہے تو ہم وہاں ناکام ہوجاتے ہیں، بیٹے تمہاری باتوں میں تلخی ضرور تھی لیکن وہ بات سو فیصد صحیح تھی، ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو جہیز کے متعلق بڑی سی بڑی باتیں تو کرتے ہیں لیکن بغیر جہیز کی شادیاں نہیں کرتے''۔

مجھے نہیں معلوم کہ مولانا نے اپنی زندگی میں ایسے کتنے جملے کہے ہوں گے جس کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری تھی، اگر ایسے جملے ہمارے دل ودماغ میں محفوظ ہوتے اور ہم اس پر عمل کرتے تو یہی مولانا کے لیے سب سے بہتر خراج عقیدت ہوتی، میں ان جملوں کو آج بھی محسوس کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہمارے درمیان نہ جانے علماء کرام کی کتنی بڑی جماعت ہے، لیکن کتنے ہیں جو مولانا عبدالحمید صاحب کے

خیالات سے متفق ہیں، یا ان کے خیالات سے دوسرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں، اور علماء کرام ہی کیوں؟ یہ ذمہ داری تو ہر اس فرد پر عائد ہوتی ہے جس نے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو عام کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔

یہ ذمہ داری تو گھر میں رہنے والی اس عورت سے شروع ہوتی ہے جو سب سے پہلے بچے کے سر پر ممتا کا آنچل رکھتی ہے، یہ ذمہ داری اس باپ کی ہے جو اپنے گھر، خاندان کی کفالت برداشت کرتا ہے، لیکن میں نے خاص طور سے علماء کرام کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنہیں خود اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے، عالم اسلام میں عالم کو جو مقام و مرتبہ میسر ہے، اس کی ہمسری ناممکن ہے، کبھی کبھی علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے ممتاز ہو جاتی ہے، کیونکہ علماء کرام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے مطلق کی بندگی کی طرف لانے میں انبیاء کرام کا کردار ادا کرتے ہیں، اور اس امر کی بنا پر علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا ہے، اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے سینوں میں پوری کائنات کا راز پنہاں ہے، ان کی صبح خدا کی حمد وثنا سے شروع ہوتی ہے اور سورج ان کی حمد وثنا کے بغیر غروب نہیں ہوتا۔

کیا یہ سوال میں پوچھ سکتا ہوں؟ کہ وہ کون ہیں جن کے سینوں میں قرآن کے الفاظ پنہاں ہیں، دنیا کی وہ کون طاقت ہے جو اس طاقت سے بڑھ کر ہے، علماء کرام، حفاظ کرام کے علاوہ وہ کون ہیں جو مدرسوں میں بیٹھ کر حق وصداقت کی صدائیں بلند کرتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں، جن کی تعریف اس کائنات کا بنانے والا کر رہا ہو، اس کے فہم وادراک کا یہ عالم ہے کہ انسان کی جھوٹی زبان سے جھوٹی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے، جسے انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہو وہ اپنا مقابلہ دنیا کے ان ناکارہ لوگوں کے ساتھ کرنا چاہتا ہے جنہیں حق و باطل کی تمیز ہی نہیں ہے، وہ اپنے علم کو دولت کے سامنے نیلام کرتا ہے، اور یہ بھی اندازہ نہیں کہ دونوں کے مابین بنیادی فرق کیا ہے؟ وہ شب و روز اپنے قیمتی سرمائے کو دولت کی دیوی پر نچھاور کرتا رہتا ہے، اسلاف کی تاریخ دیکھئے جنھوں نے چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رکھی تھیں، سمندر کے تلاطم کو اپنی ابروئے چشم کا غلام بنا رکھا تھا، اور نسیم سحر کو صدائے حق کا پیامبر! افسوس صد افسوس ہم ہیں کہ اپنی بے بسی کا ماتم کر رہے ہیں۔

اغیار مہر و ماہ سے آگے نکل گئے
الجھے ہوئے ہیں صبح کی پہلی کرن سے ہم

کیا یہ سوال ہمارے ذہن کو متاثر نہیں کرتا کہ ہمارے بچے تعلیم کے میدان میں کئی راستے پر کھڑے ہیں، کیا ہم کبھی اس پر غور کرتے کہ تناور درخت کا وجود جہاں اس کی موٹی موٹی ڈالیوں پر ہے، یہ نازک سی سبز پتیاں بھی اس کے وجود کا ایک اہم حصہ ہیں، ہم کسی قوم کو ترقی کے راستے سے اس وقت تک ہم کنار نہیں کر سکتے جب تک قوم کے بچوں کے ذہن کو بیدار نہ کر سکیں، یعنی اسے ہم تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ کر سکیں، مجھے تعلیم کے فلسفے پر کوئی بڑی لمبی چوڑی گفتگو کرنے کا شوق نہیں اور نہ ہی یہاں مجھے اس امر سے سروکار ہے، خیالات کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے مجھے مولانا عبدالحمید صاحب قاسمی کی چند باتیں یاد آ گئیں جو انہیں نے مجھ سے کہی تھیں کہ ''ہمارے بچے جن ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کر رہے ہیں اس میں نہ جانے کیسے کیسے سبق کا انتخاب کیا گیا ہے، جس سے بچوں کی تربیت تو کیا اچھی تعلیم بھی نہیں ہو سکتی، ہمیں اپنے بچوں کے لیے خود اچھے نصاب کا تعین کرنا چاہئے''۔

مندرجہ بالا جملوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالحمید صاحب کا دل و دماغ کس قدر روشن تھا، کیا ہمارے درمیان ایسے افراد ہیں؟ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ چھوٹے سے قصبے میں رہنے والا آدمی خیالات کے کن بلندیوں پر جلوہ گر تھا، اگر ہم اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر سوچیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبدالحمید صاحب قوم کی فلاح و بہود کے لیے کس قدر پریشان تھے، کوئی ایسا پروگرام یا کوئی ایسا مذاکرہ نہیں تھا، جس میں وہ اپنی خرابی صحت کے باوجود نہیں پہنچتے اور اپنی جامع اور مختصر آراء سے لوگوں کو نہیں نوازتے۔ ﴿بقیہ......اگلے صفحہ ۴۰ پر﴾

دعوت فکر

مسلم معاشرے میں تعلیم کے تئیں بے حسی آخر کب تک؟؟؟

پیشکش: فیروز بخت احمد صاحب ذاکر نگر، نئی دہلی

بظاہر پرانی دہلی کا فصیل بند شیر شاہجہاں آباد ایک ایسا انسانی خطہ نظر آتا ہے جہاں کے شب وروز مغلائی کھانوں، کبوتر بازی، پتنگ بازی اور سب سے زیادہ بے تحاشہ چیخ چیخ کر کردار کشی کرتے پوسٹروں میں ڈوبے نظر آتے ہیں، یہ بات حقیقت سے بہت قریب ہے، مگر پرانی دہلیت کا روپ اور بھی ہے، جو قدیمی تہذیب تمدّن کا حامل ہے، جو آج کے پراگندہ لاابالی اور آلودگی کے ماحول کے زیر سایہ تقریباً تقریباً غائب ہوتا جارہا ہے، وہ پرانی حویلیاں، علمی محفلیں اور آداب اب داستانِ پارینہ بن چکے ہیں، آج اس خطہ میں اگر سب سے زیادہ تشویشناک بات کوئی ہے تو وہ ہے پرانی دہلی کے مسلمانوں کی بڑھتی جہالت، اگر تجرباتی اور سماجیاتی نقطہ نظر سے فصیل بند شیر کے شب وروز کا مشاہدہ کیا جائے تو جہالت، شہری وآئینی حقوق کے تئیں ظالمانہ بے حسی اور ایک عام سماجی و دانشورانہ بےعملی اس قدیم معاشرے کا جزولاینفک نظر آتے ہیں۔

انہیں نامساعد حالات کی تبدیلی کی خواہش کے پیش نظر ۲/اکتوبر ۱۹۸۳ء میں احاطہ کالے صاحب، واقع بلی ماران کے ایک تنگ وتاریک کمرے میں شاہجہاں آباد کے کالج میں زیر تعلیم کچھ نوجوان سر جوڑ کر بیٹھے کہ کس طرح سے تنزلی کی جانب تیزی سے بڑھتے مسلم معاشرے کی اصلاح کی جائے، یہ نوجوان تھے:

فیروز بخت احمد، محمد اطیب صدیقی اور اقبال محمد ملک فیصلہ یہی ہوا کہ وقت کی اشدترین ضرورت تعلیم ہے، قائد مزدور ناردرن ریلوے مینز یونین کے صدر کامریڈ آفتاب احمد صدیقی کی زیر سرپرستی ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کا قیام عمل میں آیا، میدان تعلیم میں انقلاب لانے کا ان نوجوانوں نے محض عزم مصمّم ہی نہیں کیا بلکہ عملی طور پر پہلے دن سے ہی اس کی ترجمانی بھی شروع کردی، اس تنظیم کا کلیدی نارہ ہے، ''خودآگہی'' اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' نے پرانی دہلی کے دم گھونٹنے والے زوال دہ ماحول میں جدید فکر وعمل کی نئی راہیں کھول کر تازہ ہوا کے جھونکے کا کام انجام دیا ہے، یہی نہیں بلکہ ہر قسم کی مخالفت و پریشر سے ابھر کر یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ایک مکمل طور پر بےعمل اور تغیر پذیر معاشرے کو بیدار کرنا اور علمی ترقی کی راہ پر گامزن کرانا انتہائی سخت محنت اور دوراندیشی کا متقاضی تھا مگر ہر قسم کے آندھی اور طوفان کا مقابلہ کر کے یہ نوجوان بجائے لغویات وتفریحات کے تعلیم کی افادیت کو مقبول عام کرنے میں مصروف رہے، کامریڈ صدیقی کی وفات کے بعد اس نوزائیدہ تنظیم کے اصلاحی پروگرام کی سرکردگی کا بار صاحب فکر اور پیکرعمل نوجوان فیروز بخت احمد کے کاندھوں نے سنبھال لیا جو مولانا آزاد کے پوتے ہیں اور اس انجمن کی فکری تعمیری اور عملی رہنمائی کررہے ہیں، انہوں نے بتایا ''آفتاب صاحب کی رحلت ہمارے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ثابت ہوئی؛ لیکن اپنے پختہ ارادے اور خدمت خلق کے شدید جذبے کی بنا پر مقامی غنڈوں اور سیاسی دلالوں کی مخالفتوں کے باوجود ہم نے حوصلہ نہیں ہارا اور علم ودانش کا نور پھیلانے کے مشن پر ثابت قدم رہے''۔

عملی طور پر ہی نہیں بلکہ فکری طور پر بھی فیروز بخت نے صحافت کے میدان کا اپنے زور قلم کے ذریعہ اردو، ہندی وانگریزی کے اخبارات و

رسائل میں مسلمانوں کے شعور کو بیدار کرنے کی مہم چلا رکھی ہے جس کا مقصد تعلیم کا نور پھیلانا ہے، بقول فیروز اس وقت مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہیں، ایک مذہبی گروہ جس کی قیادت علماء کرام فرما رہے ہیں اور جن میں اکثریت ایسے علماء حضرات کی ہے جو اپنی دوکان قیادت کو چمکانے کی فکر میں اپنے اپنے ماننے والوں کو لے کر اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں اور دوسرا طبقہ یوروپ اور امریکہ کی مغربی تہذیب کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے یا بنانے کی فکر میں ہیں، یہ گروہ کافی بڑا ہے اور خود کو ''دانشور'' طبقہ کہلانا پسند کرتا ہے کیونکہ سائنسی ترقیاں اور ظاہری آرام و آسائش و آب و تاب بہت خوشگوار چیزیں معلوم ہوتی ہیں، ضروری ہے کہ یہ دونوں گروہ بجائے دست و گریباں کے تعمیری کام کریں۔

اسی انتھک اور مخلصانہ کوشش کی بنا پر آج شاہجہاں آباد کے گلی کوچوں، محلوں اور کٹروں میں ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کا نام زدِ خلائق بن گیا ہے، آئے دن فکر مند والدین، پریشان اسکولی طلباء، استحصال زدہ اساتذہ اور مالی بحران کے شکار اسکولوں کی انتظامیہ کے اراکین ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کے دروازے کھٹکھٹا کر اپنے مسائل حل کرتے نظر آتے ہیں، دہلی کے تاریخی اور قدیم ترین اردو میڈیم اسکول اینگلو عربک کے پرنسپل صاحب کا ماننا ہے کہ اب جو تعمیری بہتری اسکول میں آئی ہے اس کا سہرہ فرینڈز فار ایجوکیشن کی کاوشوں کو ہی جاتا ہے جسکی وجہ سے عربک اسکول کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن محترک ہوئی اور اس کے ممبران نے اسکول کی بلڈنگ کی مرمت اعلیٰ ذہن و فکر کے حامل اور سماج کے پسماندہ طبقوں کے درمیان رہ کر کام کرنے کا حقیقی عزم رکھنے والے افراد کی مناسب تعداد تک محدود رکھا گیا ہے اور عموماً نئی رکنیت نہیں دی جاتی۔

محمد اطیب صدیقی جو تنظیم کے قانونی امور کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں اور سپریم ہائی کورٹ دہلی کے قانونداں بتاتے ہیں، کہ ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کو پیشہ ور سیاست دانوں اور نام نہاد سوشل ورکروں سے (جنکی تعداد دہلی میں بہت زیادہ ہے) محفوظ رکھنے کے لئے اکثر تکلیف دہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں، انہوں نے عام تعلیمی بے حسی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ تنظیم نے معاشرے میں اصلاح لانے کی خاطر خواہ کوشش کی ہے، دس سال قبل تک دہلی والے یا تو اپنے حلقے کی سیاست کے بارے میں بحث و تکرار کرتے نظر آتے تھے یا کبوتر بازی اور پان چبانے میں مصروف رہتے؛ لیکن ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کی سخت محنت و مسلسل جدوجہد کہ نتیجے میں آج اتنی خوشگوار تبدیلی ضرور رونما ہوئی ہے کہ شہریوں کی کافی بڑی تعداد اب بچوں کو بہتر و برتر تعلیمی اداروں میں داخل کرنے کے سلسلے میں جدوجہد کرتی نظر آئی ہے۔

''فرینڈز فار ایجوکیشن''، تعظیم کے لائق ہے کیونکہ اس نے سماجی سطح پر بہت سے ایسے کام کرائے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے، یہ اسی تنظیم کی ہمت تھی کہ اس نے غالب کو اس کی قیام گاہ دلوئی، خاقانی ہند استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے مزار پر بنے بیت الخلاء منتقل کرائے اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اطراف ہونے والی نازائز تعمیرات کو رکوایا، اس تنظیم کا بنیادی طریقہ کار عوامی رابطہ پروگراموں پر مبنی ہے، اس سے بہتر عملی نتائج حاصل کئے جا رہے ہیں، اس تنظیم کے ارکان اکثر نماز جمعہ کے بعد مختلف مساجد کے باہر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نمازیوں کے ساتھ ان کے طرز رہائش میں سدھار، جسمانی روحانی صفائی و پاکیزگی، اسکولوں جی حالت زار میں بہتر وغیرہ جیسے موضوعات پر زندہ و توانا مباحثے کرتے نظر آتے ہیں، فیروز بخت نے انکشاف کیا کہ ایک دفعہ تنظیم کے ارکان نے ایک محلے کے اسکولی بچوں کے بدوضع جوتوں پر خود پالش کیا جس کی بنا پر طلباء اور ان کے والدین اس قدر پشیمان ہوئے کہ اس واقعہ کے بعد ان کے بچے کبھی گندی حالت میں اسکول نہیں گئے، یہ علاقہ بارہ ہندوراؤ کا احاطہ کیدارہ تھا، اس کے علاوہ ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' نے پرانی دہلی میں پولیس کی زیادتیوں کی جانچ کرکے ایک پریس رپورٹ تیار کی جسکی ۱۹۸۶ میں اشاعت کے بعد کم از کم بلی ماران لال کنواں علاقہ میں پولیس کا رویہ نرم پڑا ہے، علاقہ کے لوگ آج بھی وہ دن یاد رکھتے

ہیں، جب لال کنواں میں گلی قاسم جان کے نکڑ پر پولیس نے دو جواں سال لڑکوں کے بھیجے اڑا دئے تھے، اسی طرح جب جب شہری حقوق کی پامالی ہوئی تب تب اس تنظیم نے ظلم سے دو چار لوگوں کے زخموں پر مرہم کا پھایہ رکھا۔

تعلیم نسواں موجودہ مسلم معاشرے میں آج بھی بہت پیچھے ہے، تنظیم نے اس جانب بھی پیش قدمی کر کے والدین کو آگاہ کرایا کہ وہ فوراً اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیں کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے مسلم لڑکیاں ضدی ہوجاتی ہیں یا یہ کہ انہیں آگے چل کر اپنی جیسی قابلیت کا شوہر نہیں مل پاتا، تنظیم نے خواتین کو عورتوں کے دینی سماجی اور تعلیمی حقوق سے آشنائی کے لئے کئی پروگرام کئے ہیں، تنظیم کے خواتین سیل کی نگرانی محترمہ قیصر جہاں بیگم صاحبہ (مرحومہ) و ڈاکٹر صادقہ ذکی کے ہاتھوں رہی، قیصر جہاں بیگم صاحبہ نے اسکولی مسلم بچیوں کے لئے مخصوص دینی تعلیم کا کورس بھی شروع کرایا، ڈاکٹر صادقہ ذکی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کی لکچرر ہیں اور انکا خیال ہے کہ آج عورتوں کے حقوق کی جانب اب پہلے سے زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے، مگر باوجود اسکے استحصال اب بھی ہورہا ہے، کچھ عرصہ قبل تنظیم نے ''مسلم گرل چائلڈ'' نام کا پروگرام بھی شروع کیا ہے جس میں چھوٹی چھوٹی میٹنگیں کر کے مسلم حلقوں کے لوگوں کو اس سلسلہ میں باور کرایا گیا، تنظیم کے ذریعہ کئے گئے ایک سروے میں چند سنسنی خیز انکشافات تعلیم نسواں کے سلسلہ میں دیکھنے کو ملے۔

۲۰۰۱ء دہلی میں مسلم لڑکیوں کے بارہویں جماعت کے نتائج نہایت ہی خستہ رہے، صرف ۱۴؍فیصد لڑکیاں ہی پاس ہو پائیں جن میں سے صرف ایک فیصد لڑکیوں کو کالج میں داخلے ملے، پچھلے پانچ سال کے سروے کی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہر پانچویں کلاس میں داخل ۱۰۰؍ مسلم لڑکیوں میں سے صرف ۱۵؍ہی بارہویں تک اپنی تعلیم مکمل کر پاتی ہیں جبکہ غیر مسلم لڑکیوں میں ۵۶؍لڑکیاں بارہویں جماعت پاس کر لیتی ہیں، کالج میں ۲۶؍فیصد ان میں سے داخلہ حاصل کر لیتی ہیں۔

تنظیم کے ایک اور اہم مقصد جس کی جانب فیروز بخت نے توجہ دلائی وہ ہے اسلامی ذہن کے علمی و تعلیمی نقطہ نظر کی جامعیت، اس کے فوائد اور اس کے دوررس اثرات کی جستجو کی جانب شائقین کے ذہنوں کو متوجہ کرنا، بقول فیروز صاحب آج مسلمانوں کے لئے ایسے ہی نظام تعلیم کی حاجت ہے جو ان کی دینی و دنیوی دونوں ضروریات کا کفیل و ضامن ہو، اگر اسلامی اقدار و معاشرت کو چھوڑ کر دنیوی ترقی کی ملت اسلامیہ عرصہ تک زندہ و باقی نہیں رہ سکے گی، اگر دنیوی تقاضوں سے انہوں نے منہ موڑ لیا تو دنیوی ترقی و فلاح اور بہود و کامرانی کی زندگی بسر نہیں ہوسکتی اور مسلمان سابق دستور پسماندہ قوم بن کر رہ جائیں گے، درحقیقت علوم جدیدہ اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں، ماضی میں مسلمانوں نے دوسری قوموں کے عقلی علوم سیکھ کر ہی ان کی امامت کی ہے اور اجتہاد کا درجہ حاصل کیا ہے، تنظیم کے ایک اور اہم رکن اقبال محمد ملک نے کہا کہ دہلی کی دینی درسگاہوں میں معیار تعلیم روز بروز پست ہوتا چلا جارہا ہے، یہ پستی نہایت ہی خطرناک نتائج پیدا کرے گی اور کر رہی ہے کیونکہ فی الوقت دین کی تشریح و تجدید علماء کی ہی ذمہ داری ہے، ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے لوگ نہ صرف اپنے نصاب تعلیم پر نظر ثانی کریں اور ان کو علوم جدیدہ سے ہم آہنگ بنائیں بلکہ گرتے ہوئے معیار تعلیم کو بھی روکیں اور اس کو اتنا بلند کریں کہ اجتہادی نظر رکھنے والے علماء و فضلاء دوبارہ ان مدارس سے نکلیں جو روشن خیالی اور وسعت نظری سے دین کی تشریح و تعبیر کریں اور ملت کی اسی طرح سے بے لوثی اور وقار کے ساتھ خدمت کریں جو کبھی اکابرین کا ثمرہ امتیاز رہا ہے۔

''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کے اراکین کا خیال ہے کہ پچھلے تقریباً پچاس سال سے تعلیم میں جذبہ ایثار و قربانی و خدمتِ خلق کے بجائے کاروباری ذہنیت کا اثر زیادہ دیکھنے میں آیا ہے، جمہوری حکومت نے آئین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تعلیم کے فروغ کی اپنی کوششوں کو تیز تر کیا تو اس کے لئے سرمایہ بھی فراہم کیا، اس کی چمک دمک نے ایسے بہت سے لوگوں کی اپنی طرف متوجہ کیا جس کا تعلیم سے کوئی تعلق کبھی بھی نہ رہا، بے غرض لوگوں کے بجائے خود غرض لوگ،

ایثار پیشہ کے بجائے استحصال پیشہ لوگ اسکولوں، کالجوں کی جانب متوجہ ہونے لگے، پھر تجارت کی سی لوٹ کھسوٹ اور چھین جھپٹ یہاں بھی شروع ہوگئی، بقول پروفیسر جناب عتیق احمد صدیقی (شعبہ تعلیم، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی) انتظامیہ، معلمین اور طلباء تعلیمی اداروں کے ستون ہیں، مگر تینوں ہی اس بدلے ہوئے تعلیمی رجحان سے متاثر ہیں، آزادی کے بعد جو نیا سلسلہ اسکولی انتظامیوں میں دیکھنے میں آیا تھا، تعلیمی اداروں کی جائداد پر یا تو خود قابض ہونا یا اسکو خرد برد کرنا۔

قدیمی درسگاہوں کے ساتھ ان کے بانیین کی وقف کردہ بہت سی املاک ہیں، واقفین کا یہ مقصد تھا کہ ان کی آمدنی سے اداروں کی ضرورتوں کی کفالت ہوتی رہے، اسی سے عملہ کی تنخواہیں دی جائیں اور تعمیرات و عمارت کی تجدید کاری کا کام ہو، ساتھ ہی مستحق و نادار طلباء کی بھی امداد کی جاتی رہے، اس کا اثر آج کے منتظمہ کے افسران پر یہ ہوا کہ خود غرضی لالچی اور ہوس کے شعلے ان کے ذہن میں بھڑک اٹھے اور انہوں نے بے دریغ ''مال غنیمت'' کولٹانا شروع کر دیا، اسکول چاہے دہلی کے اینگلو عربک، فتحپوری مسلم اسکول، قومی اسکول، شفیق میموریل یا مظہر الاسلام ہوں یا سہارنپور کا مسلم گرلز انڈسٹریل انٹر کالج ہو یا جمشید پور (بہار) کا سب سے مشہور مسلم انٹر کالج ہو، ان سبھی کی انتظامیوں میں زیادہ تر اشخاص ایسے ہیں جو تعلیم کے ذریعہ اپنی دوکانیں کھولے بیٹھے ہیں، یہ اسکول تو کبھی کے بند ہو چکے ہوتے مگر خدا بھلا کرے ایسے چند حضرات کا انہیں انتظامیوں کے ممبر ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنے دوسرے ممبر ساتھیوں سے باز پرس کرتے رہتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ممبران انتظامیہ اپنے منیجر، خزانچی، سکریٹری، صدر وغیرہ منصبوں کے بجائے ذاتی و سیاسی مفادات کے اپنی اپنی درسگاہوں کی فلاح پر مرکوز کریں۔

''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کے ارکان تعلیمی نظام کے تمام لوازمات کو زیادہ انسانی بنانے کے سلسلے میں بھی کوشش کر رہے ہیں، تنظیم کے رکن اطیب صدیقی نے شیکسپیئر کے فرسودہ نظریہ ''پٹائی نہ کرنا بچہ کو بگاڑنے کے مترادف ہے'' کی سخت مزمت کی ہے، انہوں نے دہلی ایجوکیشن ضوابط ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۳۷ کی جس میں اسکولوں میں جسمانی سزا کی اجازت دی گئی ہے، سخت مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ دفعہ آئین ہند کے آرٹیکل ۲۱ کی تنسیخ کرتی ہے، اسی وجہ سے ایک اور پروگرام: ''بچے کی مسکراہٹ واپس لاؤ'' کے عنوان سے ایک پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے تاکہ اساتذہ اور والدین کے ذریعہ کئے جانے والے بچوں کے جسمانی وجذباتی استحصال کو منظرعام پر لایا جاسکے ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کی معرفت مسز عمیمہ صدیقی نے سپریم کورٹ میں اسی سلسلہ میں مقدمہ دائر کیا ہے جس میں انہوں نے اعلیٰ اسکولوں میں کے، جی ونرسری کلاسوں میں داخلے کے مقصد سے لئے جانے والے امتحانوں کو چیلنج کیا ہے، اس قدر کم عمر میں بچوں کے ساتھ یہ زیادتی ہے اور انکی ذہنی و جسمانی ارتقاء کے لئے یہ سسٹم قاتل ثابت ہوا ہے اور انکی نشونما پر اس نے برا اثر ڈالا ہے، عمیمہ صدیقی ڈان باسکو اسکول میں سینئر معلّمہ ہیں اور تنظیم کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہیں۔

چاہے فصیل شہر میں ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کی مذکورہ بالا کارروائیوں سے شہر کے گلی کوچوں میں کوئی فوری سماجی انقلاب برپا نہ ہو؛ لیکن اس کے روح رواں فیروز بخت احمد کے خیال میں ''فرینڈز'' کے ذریعہ متعارف کئے گئے افکار جدید دہلی کی قدیم جاگیداری اقدار اور نئے روشن خیال طبقہ کے درمیان فکری و دانشورانا سوچ کو ضرور منکشف کرتے ہیں، پچھلے دنوں فیروز بخت نے اپنے ہم خیالوں کے تعاون سے ایک جامع سروے رپورٹ بعنوان ''کیا اسی کو تعلیم کہتے ہیں؟'' مرتب کی ہے، جس میں پرانی دہلی کے بالخصوص مسلمان بچوں کی تعلیمی پسماندگی اور اس سے جدوجہد کرنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی ہے اور واضح کیا ہے کہ اگر مسلمان بچے بہتر تربیت حاصل کرلیں تو ان سے زیادہ ذہین کوئی نہیں، فیروز نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ آج کے پرآشوب دور میں بھی تعلیم جیسے اہم سوال پر دہلی کے مسلمان بے زبان بنے ہوئے ہیں ''یہ لوگ کیبل ٹی، وی، دیکھتے ہیں، لحیم شحیم دعوتیں کرتے ہیں، ملبوسات وزیورات پر سرمایہ ضائع کرتے ہیں اور گلی محلوں کی گھٹیا

سیاست میں اپنے قیمتی شب وروز تمام کرتے ہیں، اچھائی کی تلقین کرنے والے کو گھٹیا القاب سے ہی نہیں بخشتے بلکہ پھبتیاں بھی کستے ہیں، تعلیم کی جانب ان میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی دیتی، ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کے ایک جنرل سکریٹری اقبال محمد ملک کا خیال ہے کہ مسلم طبقہ میں تعلیمی زبوں حالی کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ قوم نے قرآنی نظریہ تعلیم کو نہیں اپنایا جیسا کہ اسلام کی شروعات کے وقت کیا گیا تھا، اقبال ملک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو دھراتے ہیں کے جو مسلمان علم اور تعلیم کی جستجو میں راستہ طے کرتا ہے تو وہ جنت کے راستہ کو ہموار کرتا ہے، اس کے اس عمل سے خوش ہو کر فرشتے اس کے لئے بازو بچھا دیتے ہیں، سارے آسمان و زمین اور یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی علم حاصل کرنے والوں کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

اردو میڈیم اسکولوں کی تعلیم کے سلسلہ میں رواں دواں ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کو آج ۱۸ سال ہو چکے ہیں اور اس وقت تعلیم میں مصروف تین نوجوانوں پر مشتمل ٹیم آج بھی اسی ولولہ اور ایثار سے اس خدمت میں مصروف ہے، فیروز بخت احمد نے تنظیم کی جگہ اگر میڈیا میں بنائی تو اقبال ملک نے گھر گھر جا کر والدین، اساتذہ وطلباء کو تعلیمی معلومات و پمفلیٹ وغیرہ فراہم کئے، بغیر کسی سے ایک پیسہ کا فنڈ لئے یا کسی سرکاری وغیر سرکاری تنظیم سے مدد لئے اور صرف اپنے جیب خرچ سے یہ کام چلانا کتنا دشوار ہے یہ سمجھنا کوئی دشوار کام نہیں، کم از کم ان نوجوانوں کی کاوش سے یہ تو فرق پڑا کہ آج مسلم فرقہ میں پچھلے بیس تیس سال کے مقابلہ میں تعلیمی بیداری پیدا تو ہوئی ہے، مگر افسوس کی بات ہے کہ باوجود اس سب کے ان اسکولوں کی انتظامیہ آج بھی چھین جھپٹ اور لوٹ کھسوٹ میں معروف ہیں، اسکول کھولنا ایک خدمت کا نہیں نفع بخش کاروبار کا ذریعہ بن گیا ہے، بہرحال کوئی مسئلہ ماتم یا مرثیہ خوانی سے حل نہیں ہوا کرتا، اس کے لئے ہر طرح کی سوچ اور عمل کا ہونا اشد ضروری ہے، ہمیں خوشی ہے ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' جیسی کچھ تنظیمیں آج میدان تعلیم میں سرگرم ہیں۔ ❁❁❁

﴿بقیہ...... صفحہ ۳۵ رکا﴾ ہم بڑے ہی قحط الرجال افراد میں شامل ہیں، آج ہمیں ویسے ہی صاحب علم وفن کی ضرورت ہے، جس میں وہ اپنی کشتی کو منزل مقصود تک پہنچا سکیں، امت آج جن مسائل سے دوچار ہے ہر طرف سے لوگوں کی نگاہیں ہم پر اٹھتی ہیں، ایسے پرآشوب دور میں مولانا عبدالحمید صاحب جیسا مخلص کارکن ملنا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری کوتاہیوں سے مولانا عبدالحمید صاحب کا لگایا ہوا تناور درخت سوکھ جائے اور ہم ان کی آرزؤں پر پانی پھیر دیں، لوگ ہم پر انگشت نمائی کریں اور فضاؤں میں یہ آواز گونج اٹھے۔

اس صبح درخشاں سے بہتر وہ اندھیرے ہیں
تب زخم پر پردے تھے اب داغ چمکتے ہیں

غـــــزل

کرتا ہے مجھے یاد وہ کافر تو مجھے کیا
روتا ہو اگر وہ مری خاطر تو مجھے کیا
شاعر ہوں کہا کرتا ہوں سچ بات ہمیشہ
وہ شخص ہے اخبار کا تاجر تو مجھے کیا
اس نے تو الٹ دی مری جیتی ہوئی بازی
اس کو بھی ملا ہو کوئی شاطر تو مجھے کیا
میں نے تو کھلے رکھے تھے آنکھوں کے دریچے
آیا نہ پلٹ کر وہ مسافر تو مجھے کیا
تصویر میرے خواب کی اس نے نہ بنائی
دنیا اسے کہتی ہے مصور تو مجھے کیا
سالکؔ کے سخن کو نہ سنا اس نے مگر اب
کہتا ہے کہ خوش فکر ہے شاعر تو مجھے کیا

سالک بستوی
مقام غور بجھا بازار ضلع سدھارتھ نگر

محاسبہ

مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

مولانا فتح محمد ندوی جامعہ ملیہ دہلی

مدینہ میں اسلام کی آمد سے پہلے یہودیوں کے علاوہ دو قبیلے اوس وخزرج بھی آباد تھے، ہجرت سے پہلے مدینہ کی قیادت وسیادت اور اثر ورسوخ یہودیوں کو حاصل تھا، صدیوں سے زائد مدت سے یہودی قوم مدینہ میں آباد تھی اور ان لوگوں کی معاشی اور اقتصادی حالت اوس وخزرج کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھی، جس کی وجہ سے یہودیوں نے ہمیشہ اوس وخزرج کو اپنا غلام بنا کر رکھا، اور ان کو ترقی کے بارے میں کبھی سوچنے کا موقع تک نہیں دیا، لیکن ان لوگوں نے آہستہ آہستہ ترقی کے منازل طے کرنا شروع کردیئے، جب یہودیوں نے دیکھا کہ دونوں قبیلے ترقی کی شاہ راہ پر رواں دواں ہیں، تو ان کو حسد ہوا، اور یہودیوں نے یہ سوچا کہ اگر اوس وخزرج نے اپنی معاشی اور اقتصادی حالت بہتر بنالی، تو ہماری قیادت خطرہ میں پڑھ سکتی ہے اور کسی بھی وقت یہ دونوں قبیلے ہم پر غالب اور حاوی ہوسکتے ہیں، اس لیے ان کا ابھی سے تدارک کیا جائے اور ان کی بڑھتی ہوئی ترقی کو کسی بھی صورت میں روکا جائے، ورنہ وہ دن دور نہیں جب یہ دونوں قبیلے ہم سے اپنا بدلہ چکائیں گے، تو یہودیوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ دونوں قبیلوں کو آپس میں لڑا دیا جائے، کیونکہ بزدل قوم کا سب سے بڑا ہتھیار سازش ہوتا ہے، تو یہودی حسب دستور اپنے سازشی مزاج سے ان دونوں قبیلوں کو لڑانے میں کامیاب ہوگئے، اور یہودیوں کے کچھ قبیلے اوس کی طرف ہوگئے اور کچھ خزرج کی، تاکہ ان دونوں کے درمیان کبھی بھی صلح نہ ہوسکے، یہودیوں کی اس مذکورہ حکمت عملی کو دونوں قبیلے سمجھ نہ پائے اور دیکھتے ہی دیکھتے آپس میں دست وگریباں ہوگئے، بھائی بھائی کا دشمن ہوگیا، اور یہودی اپنی قیام گاہوں میں بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہے، تقریباً ایک صدی تک ان دونوں قبیلوں کے درمیان آپسی خانہ جنگی رہی، اور دونوں قبیلے کے لوگ صدیوں تک ایندھن کی طرح جلتے رہے اور یہودیوں نے ان کو یہ سوچنے کا موقع تک نہیں دیا کہ ہمارے دونوں قبیلے کے بہادر نوجوان اس آپسی خانہ جنگی کی نذر ہوگئے، ایک طویل مدت کے بعد ان دونوں قبیلوں کو ہوش آیا لیکن اس وقت وہ اپنا سب کچھ کھو چکے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ان کے درمیان صلح ہوئی، اور ایک طویل خونی معرکہ کے بعد ان کو چین وسکون ملا۔

اس مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہودیوں نے اپنے مذموم مقصد کی تکمیل کے لیے انسانیت سوزی کے وہ کارنامے انجام دیئے جنھوں نے دنیا کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کا اضافہ کیا اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری وساری ہے، ہمارے سامنے اس کی ایک مثال نہیں بلکہ ہزاروں مثالیں موجود ہیں، کہ دشمنوں نے اپنی آرام گاہوں میں بیٹھے بیٹھے دنیا کے نقشہ سے مسلم حکومتوں کا نام حرف غلط کی طرح مٹادیا، اور جو باقی ہیں ان کی صورت حال ہمارے سامنے ہیں مثلاً افغانستان، پاکستان، عراق اور فلسطین آج بھی ان کے ناپاک عزائم اور تخریبی منصوبوں کی گواہی دے رہے ہیں؛ لیکن ہمارے مسلم حکمرانوں کے دل سے احساس زیاں اور شعور انحطاط بالکل ختم ہوچکا ہے، ان کی عقلیں ماؤف ہوچکی ہیں، اور انہوں نے باب سماعت کو

مسدود کرلیا ہے، آج افغانستان اور پاکستان کی آپسی خانہ جنگی پر ہر صاحب ایمان اور امن پسند شخص رنجیدہ دل اور کبیدہ خاطر ہے، آپسی خانہ جنگی اور برادرکشی کا یہ سلسلہ بہت طویل ہو چکا ہے، دونوں ملک کے بہت سے لوگ موت کی نیند سو گئے، لیکن ابھی اس خونی ڈرامے کے ختم ہونے کے آثار نہیں؛ کیونکہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان یہ آپسی خانہ جنگی اور برادرکشی اسی وقت ختم ہوسکتی ہے جب دونوں ملکوں کے لوگ اس بات کو سمجھ لیں کہ ہماری گولیوں کا نشانہ جو لوگ بن رہے ہیں کیا ان سے کوئی ہمارا ایمانی اور خونی رشتہ ہے؟ کیا وہ لوگ قرآن کریم کی اس آیت کو بھول گئے، جس میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں'' تو اس فرمان الٰہی کے مطابق ان کا قتل کیسے جائز ہوسکتا ہے، جب کہ اسلام میں کسی جاندار کا ناحق قتل کرنا حرام ہے، تو پھر آخر وہ لوگ اپنے اس فعل سے نادم اور شرمندہ کیوں نہیں؟ مؤرخ جب ان کی تاریخ کو قلم بند کرے گا تو اس کو بھی ان حساس واقعات کو لکھتے وقت ضبط گریہ سے کام لینا ہوگا، کیونکہ اس کے سامنے دو باتیں ہوں گی، ایک تو تاریخ کو لکھتے وقت اس کو دیانت داری کا ثبوت دینا ہوگا، دوسرے طرف اس کو اس بات کا بھی احساس ہوگا کہ جب نئی نسل برادرکشی کی یہ تاریخ پڑھے گی تو وہ اپنے ماضی کے ان حساس واقعات سے کیا سبق حاصل کرے گی کہ مسلمان مسلمان سے لڑتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے، انہوں نے ہمارے سامنے کوئی اعلی مثال پیش نہیں کی، جس کو ہم اپنے لیے نمونہ اور آئیڈیل بنائیں، کیونکہ تاریخ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قومیں اپنے گذرے ہوئے واقعات سے سبق حاصل کرے۔

بہرحال جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو پاکستان اپنے وجود سے ہی جن مشکلات اور سنگین مسائل کو لے کر نمودار ہوا تھا، ان میں ہر دن مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے، ہر صبح جب بھی کسی اخبار پر نظر پڑتی ہے تو معصوم اور بے گناہوں کے خون سے اخبار کا کچھ حصہ سرخ ملتا ہے، آخر وہ کون لوگ ہیں جو بے گناہوں کا خون کرنے یا کرانے میں شریک ہیں، کیا مسلمان مسلمان کے خون سے اپنی تشنگی بجھا رہے ہیں، یا پھر وہ لوگ ہیں جو اقتدار کی خاطر انسانیت کو شرمسار کر رہے ہیں، یا ان دھماکوں کے پیچھے کچھ بیرونی عناصر ہیں جو پاکستان کی امن وسلامتی کو ختم کرنا چاہتے ہیں، بہرحال وہ کوئی بھی ہو، یہ پاکستان کا اپنا معاملہ ہے، ہمیں دخل درمعقولات کی قطعاً اجازت نہیں، اس کو وہی جانے، لیکن ہم ان کے اس فعل کی مذمت کرتے ہیں، کیونکہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال پر وہاں کے مشہور ہفتہ روزہ ''ایشیاء'' کے مدیر نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''نائن الیون کے بعد دنیا ایک نئی کشمکش سے دوچار ہوئی ہیں، اس کشمکش نے دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں کو نئے انداز سے چیلنج کیا ہے یہ چیلنج عسکری بھی ہے اور تہذیبی بھی، اس کی نوعیت معاشرتی اور معاشی بھی ہے اور سیاسی بھی ہے، اس کو ایک قومی کینوس پر دیکھیں تو پاکستان ان تمام میدانوں میں مصروف رکھا گیا ہے اس چیلنج نے بقاء کا مسئلہ بھی پیدا کیا ہے، اور بقاء باہمی کے اصول کے نئے زاویہ بھی متعارف کرائے ہیں، ہمیں سمجھنا ہوگا کہ ہم ایک نئی صورت حال میں پرانے انداز سے کشمکش کا حصہ بننے پر آمادہ ہیں، یا ایسا کرنے پر ہمیں آمادہ کیا جا رہا ہے'' ۔(تعمیرات پندرہ روزہ لکھنؤ)

بہرحال آپسی خانہ جنگی کا یہ سلسلہ کتنا طویل ہوگا اس پر ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پاکستان اور افغانستان کی تاریخ میں اس وقت ایسے لوگ مسند قیادت پر فائز ہیں جو ہر اعتبار سے نااہل ثابت ہو رہے ہیں بس میں اپنی بات کو شاعر اسلام علامہ اقبال کی اس شعر پر ختم کرتا ہوں جس میں انھوں نے مشرقی اور مغربی حکمرانوں کے درمیان فرق اس طرح بیان کیا ہے۔

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اصلاح معاشرہ

اللہ ہی رزاق ہے

مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"ومامن دآبة فی الارض إلا علی اللّٰہ رزقھا"۔(سورہ ہود پارہ ۱۲ ررکوع ۱)

اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر، مگر اللہ پر ہے اس کی روزی۔(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یعنی زمین پر چلنے والا ہر جاندار انسان ہو یا جن، چرند ہو یا پرند، بری ہو یا بحری، اس کو روزی پہنچانا خدا تعالی نے محض اپنے فضل سے اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے، جس قدر روزی جس کے لیے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی، جو وسائل واسباب بندہ اختیار کرتا ہے، وہ روزی پہنچانے کے دروازے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:" وفی السماء رزقکم وماتوعدون"۔(سورہ الذاریات پارہ ۲۶ ررکوع ۱۸)

اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)

یعنی تمہاری سب کی روزی اور اجر وثواب کے وعدے آسمان والے کے ہاتھ میں ہے، ہر ایک کی روزی پہنچ کر رہے گی، کسی کے روکے رک نہیں سکتی، بارش بھی آسمان والے کے حکم سے ہوتی ہے، جس سے غلے، میوے وغیرہ اور جانوروں کے لیے گھاس پیدا ہوتی ہے۔

خلاق ازل کے جلوے:

ارشاد باری تعالی ہے:فلینظر الانسان الی طعامه انا صببنا الماء صباً ثم شققنا الارض شقاً فانبتنافیھا حباً وعنباً وقضبا وزیتونا ونخلاً وحدائق غلباً وفاکھة وابا متاعاً لکم ولانعامکم"۔(سورۂ عبس پارہ ۳۰ ررکوع ۵)

اب دیکھ لے آدمی اپنے کھانے کو کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے گرتا ہوا پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر، پھر اگایا اس میں اناج اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گنجان باغ اور میوہ اور گھاس کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے لیے۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

اگر رب العالمین بارش نہ برسائے تو غلہ، میوہ، گھاس وغیرہ پیدا نہ ہوگا، اس سال تمام ہی انسانوں نے دیکھ لیا کہ بارش میں تاخیر ہونے سے کیا حال ہوا کھیتیاں سوکھ گئیں، بہت سے علاقوں میں حلق تر کرنے کے لیے پانی کا قطرہ تک نصیب نہ ہوا، انسانی تمام تدابیر فیل ہوگئیں"ان اللّٰہ ھوالرزاق ذو القوة المتین"۔(سورہ الذاریات پارہ ۲۷)

اللہ جو ہے وہی ہے رزق دینے والا، زور آور مضبوط۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

مفلسی اور مفلسی کے خوف سے قتل اولاد کی ممانعت:

"ولاتقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم" (سورہ انعام پارہ ۸ ررکوع ۶) اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی سے ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

دوسری جگہ ارشاد ہے" ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطأً کبیراً"۔(سورۂ بنی اسرائیل پارہ ۱۵ ررکوع ۴)

اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے، ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو، بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

جہلائے عرب مفلسی کی وجہ سے بعض اوقات اولاد کو قتل کر دیتے تھے، کہ خود ہی کھانے کو نہیں اولاد کو کہاں سے کھلائیں، اس لیے فرمایا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے تم کو بھی اور تمہاری اولاد کو بھی، دوسری آیت میں ''من املاق'' کے بجائے ''خشیۃ املاق'' فرمایا ہے، یعنی مفلسی کے ڈر سے قتل کر دیتے تھے، یہ ان کا ذکر ہے جو فی الحال تو مفلس نہیں مگر ڈرتے ہیں کہ جب اولاد زیادہ ہوگی تو کہاں سے کھلائیں گے۔

موجودہ دور میں بھی مفلسی یا مفلسی کے خوف سے دانشوران ملک نئے نئے طریقہ خوبصورت انداز میں پیش کر رہے ہیں، یہ عقل کے مدعی بجائے اس کے کہ اشرف المخلوقات کے امن وعافیت کے لیے قرآن کریم اور احادیث مبارکہ وسیرت سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو راہنما بناتے انھوں نے اشرف المخلوقات کو کم سے کم تر کرنے ہی کو افلاس اور املاق کا توڑ سمجھا ہے، جسے منصوبہ بندی، تحدید نسل، فیملی پلاننگ ونس بندی وغیرہ ناموں سے مزین کر کے اربوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے، جس کی علت یا بنیاد دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور غذائی پیداوار کی کمی کو بتلایا جا رہا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، آزادی ملک سے پہلے فی بیگہ کتنی پیداوار تھی اور اب کتنی ہے، موجودہ دور میں سائنسی ترقی کی بدولت ذرائع ووسائل بیحد بڑھ گئے ہیں، مرکب نائیڈروجن کی تیاری اس گیس کو کھاد میں تبدیل کرنے کی ترکیبیں ایجاد ہوگئی ہیں، اسی طرح دیگر ذرائع میں بھی بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے، چنانچہ بنجر زمینوں، ناقابل کاشت جنگلوں کو کھیتوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے، بعض ملکوں اور علاقوں میں ایک سال میں کئی کئی فصلیں اگائیں جا رہی ہیں، اس طرح کے حالات میں اگر آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے تو گھبرانے کی بات نہیں؛ بلکہ یہ تو قانون وطریقہ فطرت کے عین مطابق ہے، جیسے جیسے پیداوار بڑھ رہی ہے، ویسے ویسے ہی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے، اگر غذائی پیداوار کی کمی کو بالفرض تسلیم کر لیا جائے تو چونکہ مسلمان کا ایمان اللہ کی اس یقین دہانی پر ہے، جو اس نے واضح الفاظ میں '' ومامن دابة فی الارض الا علی اللہ رزقھا'' فرمادیا ہے، اس واضح یقین دہانی کے بعد ہر مسلمان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ غذا کی ذمہ داری خود اس کے اوپر عائد نہیں ہوتی جو خدا تعالی کیطرف سے اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے، وہ اس کو ضرور مل کر رہے گی، اس میں ایک گرام یا ملی گرام کی کمی زیادتی ناممکن ہے، اس لیے انسانی پیداوار کو روکنا خدا کی دی گئی یقین دہانی پر اعتماد نہ کرنا ہے، جس کی جرأت ایک مسلمان کسی حال اور صورت میں نہیں کر سکتا۔

اب تو فیملی پلاننگ والوں کو خوش ہونا چاہئے کہ ان کا کام خود بخود ہو رہا ہے، ہم جنس پرستی (قوم لوط کے عمل) کو جائز قرار دینے کی کوششیں عروج پر ہیں، جو انسانوں اور انسانوں کی آبادیوں کو تباہ وبرباد کر نیوالا عمل ہے، فرمان الٰہی ہے:"واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرنا ها تدميراً"۔ (سورہ بنی اسرائیل پارہ ۱۵؍رکوع ۲)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر (جب) وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں، تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے، پھر اس بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

یعنی جب بداعمالیوں کی بدولت کسی بستی کو تباہ کرنا ہوتا ہے، تو یوں ہی دفعۃً پکڑ کر ہلاک نہیں کر دیتے بلکہ اتمام حجت کے بعد سزا دیجاتی ہے، اول پیغمبر یا اسکے نائبین کی زبانی خدائی احکام انکو پہنچائے جاتے ہیں، جب لوگ خدائی پیغام کو رد کر دیتے ہیں اور کھلم کھلا نافرمانیاں کر کے تمام بستی کی فضا کو مسموم ومکدر کر دیتے ہیں تو ان پر ہمارا نوشتہ صادق آتا ہے، اور ہم انہیں تہس نہس کر دیتے ہیں۔

خدا سے خیر مانگو آشیاں کی
نظر بدلی ہوئی ہے آسماں کی

ہم جنس پرستوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو فطری عمل سے بغاوت پر زمین پلٹ کر اور پتھر برسا کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا، قال تعالی "فلما جاء امرنا جعلنا عاليها سافلها

وامطرنا علیها حجارة من سجیل"۔(سورۂ ہود پارہ۱۲ررکوع۷)

پھر جب پہنچا حکم ہمارا کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر نیچے اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

جبرئیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھا کر آسمان کے قریب سے نیچے پٹک دیا ،اس طرح سب بستیاں برباد ہوگئیں اور انکی ذلت ورسوائی کی پوری تکمیل کے لیے اوپر سے پتھر برسائے گئے ، ہم جنس پرستی انتہائی مذموم وقبیح فعل ہے، جو انتہائی شرمناک حیا سوز عمل ہے۔

؎ حیا سر پیٹتی ہے عصمتیں فریاد کرتی ہیں

قرآن کریم نے انسانوں کو اللہ تعالی کی ربوبیت پر ایمان لانے کا حکم فرمایا کہ تمام مخلوقات کا رب صرف اللہ تعالی ہی ہے، اسباب وذرائع سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، اس کے حکم کے بغیر تمام وسائل وذرائع مفید ومؤثر نہیں ہوسکتے ، چنانچہ قرآن کریم کی ابتدا ہی میں فرمایا "الحمدللّٰہ رب العالمین"رب اللہ تعالی کے اسماء حسنی میں سے ہے، جس کے معنی ہیں ہر چیز کو پیدا کرکے اس کی ضروریات مہیا کرنے اوراس کو تکمیل تک پہنچانیوالا"الحمدللّٰہ رب العالمین" سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو پالنے والا سارے جہاں کا ،افضل العبادات نماز کے قیام رکوع سجدے میں رب ہی کی تسبیح پڑھنے کا حکم فرمایا، عالم ارواح میں بھی "الست بربکم" کا اظہار فرمایا،سب سے پہلی وحی میں بھی "اقراء باسم ربك الذی خلق " ارشاد فرمایا"رب الناس ،رب العالمین ، رب کل شیئٍ" کا ارشاد قرآن کریم میں موجود ہے،قرآن کریم میں تقریباً تین سو بار"رب"اسم صفت کو بیان کرکے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ پختہ فرمایا کہ تمام مخلوقات کی پرورش کرنیوالی اور روزی دینے والی ذات صرف ایک اللہ تعالی ہی ہے،مسلمانوں اور تمام انسانوں پر لازم اور ضروری ہے کہ اسی ذات وحدہٗ لاشریک پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے اور ذرائع واسباب ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالی ہی کو رب مانے ، رزق کی تلاش میں اپنے خالق اور مالک سے باغی نہ ہوجائے اور یہ سمجھے کہ اسی کی اطاعت اور عبادت سے رزق بھی مل جائے گا، ارشاد رب العالمین ہے" وأمر اهلك بالصلوة واصطبر علیها لانسئلك رزقاً نحن نرزقك والعاقبة للتقوی"۔(سورہ طہ پارہ۱۶ررکوع۱۷)

اور حکم کر اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی قائم رہ اس پر ہم نہیں مانگتے تجھ سے روزی، ہم روزی دیتے ہیں تجھ کو اور انجام بھلا ہے پرہیز گاری کا۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:"ومن یتق اللّٰہ یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لایحتسب"۔(سورہ طلاق پارہ۲۸ررکوع۱۷)

اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے وہ کردے گا اس کا چھٹکارہ اور روزی دے گا اس کو جہاں سے اس کو خیال بھی نہ ہو۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

یعنی اللہ سے ڈر کر اس کے احکام کی بہر حال تعمیل کرو خواہ کتنی ہی مشکلات وشدائد کا سامنا کرنا پڑے،حق تعالی تمام مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنادے گا، اور سختیوں میں بھی گزارہ کا سامان کردے گا، اللہ کا ڈر دارین کے خزانوں کی کنجی اور تمام کامیابیوں کا ذریعہ ہے، اسی سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں، بے قیاس وگمان روزی ملتی ہے، گناہ معاف ہوتے ہیں ، جنت ہاتھ آتی ہے، اجر بڑھتا ہے ، اور ایک عجیب قلبی سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے، جس کے بعد کوئی سختی سختی نہیں رہتی ، اور تمام پریشانیاں اندر ہی اندر کافور ہوجاتی ہیں۔

سامان رزق کا مالک حقیقی اللہ تعالی ہے اور بندہ خلیفہ ونائب ہے:

جب انسان اللہ تعالی کو رب مانے گا تو لازمی طور پر جس کے پاس جو کچھ بھی ہوگا وہ اس کا حقیقی مالک اللہ تعالی کو سمجھے گا اور اپنے کو اللہ کا نائب اور خلیفہ سمجھے گا، کسی نائب اور خلیفہ کو یہ حق نہیں کہ وہ مالک کی مرضی کے بغیر اس چیز میں تصرف کرے، ارشاد فرمایا:"امنوا باللّٰہ ورسوله وانفقوا مماجعلکم مستخلفین فیه"۔(سورہ حدید پارہ۲۷ررکوع۱۷)

یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس میں سے جو تمہارے ہاتھ میں دیا ہے، اپنا نائب کرکر۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

اسی لیے خلیفہ کو فضول خرچی سے منع فرمایا کہ فضول خرچ اپنی نیابت

کے حدود سے آگے قدم بڑھالیتا ہے،ارشاد فرمایا:" ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیطن"۔(سورۂ بنی اسرائیل پارہ۱۵ رکوع۳)

اور مت اڑا بے جا، بے شک اڑانیوالے بھائی ہیں شیطان کے۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)

فضول خرچی یہ ہے کہ معاصی اور لغویات میں خرچ کیا جائے، یا مباحات میں بے سوچے سمجھے اتنا خرچ کرو جو آگے چل کر حقوق کے ضائع کرنے اور ارتکاب حرام کا سبب بنے، مال خدا کی بڑی نعمت ہے، جس سے عبادت میں دلجمعی ہوتی ہے، بہت سی اسلامی خدمات اور نیکیاں کمانے کا موقع ملتا ہے، اس کو بیجا اڑانا ناشکری ہے، جو شیطان کی تحریک اور بہکانے سے ہوتی ہے، اور آدمی ناشکری کر کے شیطان کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

رب کی مخلوق پر رحم وکرم:

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالی ایک آدمی سے فرمائے گا میں بیمار ہوا تھا تو نے میری عیادت نہیں کی، اور میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا، یا اللہ تو رب العالمین ہے، بیماری اور بھوک کا کیسے گزر ہو سکتا ہے، اللہ تعالی فرمائیں گے، میرا فلاں بندہ بیمار تھا اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے وہاں پاتا، اسی طرح بھوکے کے بارے میں ارشاد فرمائیں گے۔(مسلم شریف)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ساری مخلوق اللہ تعالی کا کنبہ ہے، اس لیے اللہ تعالی کو اس بندہ سے زیادہ محبت ہوتی ہے، جو اس کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے۔(ترجمہ حدیث)

حسن سلوک کی اہم ضروریات:

اگر چہ حسن سلوک کا دائرہ بڑا وسیع ہے، لیکن بنیادی اور اہم ضروریات خوراک، لباس اور رہائش کا انتظام کرنا ہے، اسلام نے مال و دولت والوں پر تنگدست و نادار لوگوں کے لیے یہ لازم کر دیا ہے کہ استطاعت والے غرباء کی ضروریات کا انتظام کریں ورنہ سب گنہ گار ہوں گے، اور ان سے باز پرس ہوگی، غور فرمائیے، قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون بہت کم بنائے ہیں کیونکہ قانون اور قانون ساز اداروں کی گرفت صرف اس دنیاوی زندگی تک محدود رہتی ہے، ہاں قرآن کریم اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ثواب اور عذاب کا تصور بطور عقیدہ کے امت کو سمجھایا ہے جس کے تصور سے بڑے بڑے طاقتور لرز جاتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق کا لرزنا:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں ایک دن تشریف فرما تھے، ایک دیہاتی مسلمان نے آکر یہ کہا کہ اے بھلائی کرنے والے عمر میری بچیاں ننگی ہیں، آپ نے فرمایا تو میں کیا کروں اس نے کہا تیرا فریضہ ہے کہ تو ان کو لباس عطا کر، آپ نے فرمایا کہ میں نے لباس نہ دیا تو کیا ہوگا، اس نے کہا میں واپس چلا جاؤں گا، آپ نے فرمایا پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا قیامت کے دن اللہ تعالی کے سامنے فریاد کروں گا اور تجھے پیش ہونا ہوگا، آپ نے فرمایا پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا "اما إلى النار واما إلى الجنة" یا تو دوزخ میں چلا جائے گا، یا جنت میں، یہ جواب سن کر آپ رو پڑے اور اسی وقت اپنا کرتا اتار کر دیدیا کہ فی الحال اسے کاٹ کر ان کے کپڑے بنادو اور پھر بیت المال سے آکر کپڑے لے لو۔

خوراک کے متعلق اسلامی تعلیم:

محتاجوں کی خوراک کا بندوبست کرنا دین ہے، جب کہ اس طرف توجہ نہ کرنا بے دینی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:" ویطعمون الطعام علی حبه مسکیناً ویتیماً واسیراً"۔(سورہ دہر پارہ۲۹ رکوع۱۹)

اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو ۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

یعنی اللہ کی محبت کے جوش میں اپنا کھانا باوجود خواہش اور احتیاج کے نہایت شوق اور خلوص سے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلا دیتے ہیں، قیدی عام ہے مسلم ہو یا کافر، حدیث میں ہے کہ بدر کے قیدیوں

کے متعلق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جس مسلمان کے پاس کوئی قیدی ہے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، چنانچہ صحابہ کرام اس حکم کی تعمیل میں قیدیوں کو اپنے سے بہتر کھانا کھلاتے تھے، حالانکہ وہ قیدی مسلمان نہ تھے، مسلمان بھائی کا حق تو اس سے بھی زیادہ ہے۔

رحمت عالم ﷺ کی طعام اور خوراک کے لیے تاکید:

ارشاد فرمایا وہ آدمی مومن نہیں جس نے خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھالیا اور اس کا پڑوسی بھوکا ہے، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتا ہے اور پانی پلاتا ہے، اللہ تعالی اسے جہنم سے سات خندقیں دور فرمادیتے ہیں، دو خندقوں کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ (متدرک حاکم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسلمان کو کھانا کھلانا مغفرت کو واجب کرنیوالے اعمال میں سے ہے۔ (بیہقی)

لباس کے متعلق ارشاد نبوی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی مسلمان کو ننگے پن کی حالت میں کپڑا پہناتا ہے اللہ تعالی اس کو جنت کے سبز لباس پہنائیں گے، جو شخص کسی مسلمان کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلاتا ہے اللہ تعالی اس کو جنت کے پھلوں میں سے کھلائیں گے، جو شخص کسی مسلمان کو پیاس کی حالت میں پانی پلاتا ہے، اللہ تعالی اس کو ایسی خالص شراب پلائیں گے جس پر مہر لگی ہوگی۔ (ابوداؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا جو مسلمان کسی مسلمان کو کپڑا پہناتا ہے، تو جب تک پہننے والے کے بدن پر اس کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہتا ہے پہنانے والا اللہ تعالی کی حفاظت میں رہتا ہے۔ (ترمذی)

طعام اور لباس کے بارے میں آپ ﷺ کا خطبہ:

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبیلہ مضر کے لوگ حاضر ہوئے جن کے بدن پر کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھوک اور لباس کی حالت کو ملاحظہ فرمایا جس سے چہرہ انور پر پریشانی کی علامات نمودار ہوئیں، آپ نے نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا جس میں قرآن کریم کی دو آیات تلاوت فرمائیں، پہلی آیت مسلمانوں کی بھلائی اور خیر خواہی کا خطاب ہے اور دوسری آیت میں انسانیت کے نام پر خیر خواہی اور بھلائی کا ذکر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سن کر صحابہ کرام نے غلہ، نقدی اور لباس کے ڈھیر لگادئے، اسے دیکھ کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور چمک اٹھا۔ (مشکوۃ شریف)

انسان کی تیسری ضرورت مکان:

شریعت اسلامیہ میں کسی کو گھر سے نکالنا، اس کا گھر چھیننا معیوب قرار دیا گیا ہے، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو انصار مدینہ کے ایک قبیلہ بنو عبد بن زہرہ کے محلّہ میں مکان کے لیے ایک قطعہ عنایت فرمایا، اس پر اس قبیلہ کے لوگوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ان کو کسی دوسری جگہ آباد کردیا جائے، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر مجھے اللہ نے کیوں مبعوث فرمایا، یادرکھو اللہ تعالی اس امت کو عزت نہیں دیتا جس میں کمزور کو اس کا حق نہ دلایا جائے۔ (مشکوۃ شریف)

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی حکمت ہی یہ بیان فرمائی کہ ناتواں اور کمزوروں کو ان کے حقوق دلائے جائیں۔

اللہ تعالی کی نعمتوں کو باقی رکھنے کا نسخہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی کچھ لوگوں کو خاص طور پر نعمتیں اس لیے دیتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو نفع پہنچائیں، جب تک وہ لوگوں کو نفع پہنچاتے رہتے ہیں، اللہ تعالی ان کو ان نعمتوں میں ہی رکھتے ہیں اور جب وہ ایسا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ تعالی ان سے نعمتیں لے کر دوسروں کو دیدیتے ہیں۔ (طبرانی)

عالمی خبریں World News

حافظ عبدالستار عزیزی

سعودی عرب میں پہلی مرتبہ مخلوط تعلیم والی یونیورسٹی قائم

ریاض-حکومت سعودی نے پہلی مرتبہ مخلوط تعلیم والی ہائی ٹیک یونیورسٹی قائم کرنے جارہاہے؛ لیکن تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ سرکاری تعلیمی نظام جب تک علماء کے زیراثر رہے گا جدید عہد میں قدم نہیں رکھا جاسکے گا،سعودی فرمانرواشاہ عبداللہ نے ایک ٹکنالوجی یونیورسٹی کے افتتاح کے لیے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندوں کو مدعو کیا ہے، افتتاحی تقریب عنقریب منعقد ہوگی ،اس یونیورسٹی کی اعلی سائنسدانوں نے ستائش کی ہے جس کے قیام کا مقصد سعودی سائنسداں اور انجینئرس پیدا کرنا ہے،اس یونیورسٹی کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سلطنت میں نئ نسل کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر پرائیویٹ سیکٹر کے لیے بہترین اور لائق وفائق سعودی نوجوان پیدا کئے جائیں تاکہ بیرون ملک سے آنے والے لاکھوں ورکروں پرانحصار سے نجات ملے۔

''شاہ عبداللہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی'' دنیا کے تیل برآمد کرنے والے اس سب سے بڑے ملک میں پہلی درسگاہ ہے جسے وزارت تعلیم کی دسترس سے باہر رکھا گیا ہے، جہاں علماء دین کا غلبہ ہے، اس درسگاہ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں مل جل کر تعلیم حاصل کرسکیں گے،ایک سعودی کالم نگار عبداللہ علیمی نے کہا ہے کہ تدریسی معاملے میں ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے، اورتمام تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جانا چاہئے تاکہ جدید تعلیم کی ضرورتوں کی تکمیل ہو۔

اوباما کوایرانی صدر کی نصیحت

تہران- ایران کے صدر محمود احمدی نژاد نے اپنے امریکی ہم منصب بارک حسین اوباما سے کہا ہے کہ وہ ایران کے داخلی امور میں مداخلت بند کردیں،صدارتی انتخابات پران کا تبصرہ ان کے پیش رو جارج ڈبلیو بش کی طرح لگتا ہے، اس طرح کی باتوں سے دونوں ملکوں کے مابین بات چیت کے امکانات کو نقصان پہنچ سکتا ہے، ادھر امریکہ نے ایران میں مظاہرین کے خلاف کارروائی سے ناراض ہو کر کچھ دنوں پہلے ایرانی سفارت کاروں کے دعوت نامے واپس لے لیے۔

دوبئ کے بینک میں خواتین کے لیے برقعہ لازمی

دوبئ- شریعت اسلامیہ پرمبنی دوبئ کے بینک نے تمام خواتین عملے سے کہاہے کہ وہ ملازمت کے دوران برقعہ پہنیں اور سرڈھکیں ، اس کا اطلاق غیر مسلموں پربھی ہوگا،گلف نیوز کے مطابق کل عملہ کوایک یادداشت بھیجی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ تمام مسلم اورغیر مسلم خواتین کوسر پراسکارف اور برقعہ پہننا ضروری ہوگا، برقعہ پرکوئی کڑھائی یا نگینے نہیں ہونے چاہئیں۔

وفیات

۲۸/جولائی بروز پیر۲۰۰۹ءکومولانا عزیز اللہ صاحب ندوی (ناظم ادارۃ الصدیق بہٹ سہارنپور) کی والدہ ماجدہ کا ۶۰/سال کی عمر میں انتقال ہوگیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ صوم وصلاۃ کی پابند اور ایک دیندار باحوصلہ خاتون تھیں، ادارہ ''نقوش اسلام'' مرحومہ کے وارثین کے ساتھ غم میں برابر شریک ہے اوران کوتعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے، اورقارئین سے گزارش کرتا ہے کہ مرحومہ کے لیے دعافرمائیں کہ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرماکر بلند درجات نصیب فرمائے اور پسماندگان کوصبر جمیل عطافرمائے۔

۸/اگست مطابق ۱۶/شعبان بروز سنیچر۲۰۰۹ءکومدرسہ انوارالقرآن نعمت پور کے ناظم منشی عبدالغفور صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ۷۰/سال کی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہا،مرحومہ صوم وصلوۃ کی پابند اور دینی ذہن رکھنے والی نیک خاتون تھیں،ان کے گھرانے میں حافظ وقاری کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، کچھ نواسیاں بھی حافظ قرآن ہیں، پسماندگان میں تین بیٹے مولانا ریاض احمد مظاہری،قاری محمد عارف،محمد زبیر مظاہری اورتین لڑکیاں بھی موجود ہیں۔

نماز جنازہ ان کے لخت جگر مولانا ریاض احمد صاحب مظاہری نے پڑھائی اور تدفین گاؤں کے قبرستان پیروالی میں عمل میں آئی ،تمام قارئین سے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔